

سلسلہ مطبوعات مجلس  
۵۲

# معرکہ ایمان و مادیت

میں

سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر قرآن، حدیث، قدیم تاریخ، جدید معلومات  
اور حالات حاضرہ کی روشنی میں

تالیف

مولانا ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ

مولانا محمد احسنی

مدیر "البعث الاسلامی"

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

جملہ حقوق محفوظ

# بارِ پنجم

۱۴۱۸ھ ————— ۱۹۹۸ء

کتابت	_____	ظہیر احمد کاکوری (مرحوم)
طباعت	_____	کاکوری آفست - لکھنؤ
صفحات	_____	۱۳۲
قیمت	_____	بائیس روپے

:- باہتمام :-

محمد غفران ندوی

کالاج و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ ۱۱۹  
ندوة العلماء لکھنؤ

# معرکہ ایمان

و

## ماوریت

۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۸ء

اردو \_\_\_\_\_ لکھنؤ \_\_\_\_\_ پانچواں ایڈیشن  
 عربی \_\_\_\_\_ کویت \_\_\_\_\_ متعدد ایڈیشن  
 انگریزی \_\_\_\_\_ لکھنؤ \_\_\_\_\_ تیسرا ایڈیشن



# فہرست عنوانات کتاب

”معرکہ ایمان و مادیت“

۵۰	بت پرستی و بے قیدی کی حکومت میں	۷	پیش لفظ
۵۲	انقلابی مومن	۹	سورہ کہف سے میرا تعارف
	عقیدہ کے بغیر زندگی یا زندگی کے بغیر	۱۰	عہد آخر کے فتنوں سے سورہ کہف کا تعلق
۵۵	عقیدہ	۱۲	سورہ کا صرف ایک موضوع ہے
۵۵	نرک و وطن کا صحیح طریقہ	۱۴	دجال کی شخصیت کی کلید
	ایمان و جو انمردی اور فرار الی اللہ کا		تہذیب تمدن کی تشکیل اور انسانیت کی رہنمائی
۵۶	انعام	۱۶	میں عیسائیت و یہودیت کا ملتا جلتا کردار
۵۹	ایمانی غار کی زندگی	۲۱	سورہ کہف کے چار قصے
۶۰	روم میں حالات کی تبدیلی	۲۲	کائنات کے دو نظریے
۶۲	کل کے جلا وطن آج کے ہیرو	۲۵	سورہ کہف ایمان اور مادیت کی کشمکش کی کہانی
۶۶	مادیت پر ایمان کی فتح	۲۵	اصحاب کہف
	دجالی تہذیب میں مادیت اور اس کے	۲۵	سیحی طرح اور مذہبی کہانیوں پر اصحاب کہف کا تذکرہ
۶۹	علمبرداروں کی عظمت و تقدیس	۳۹	قرآن مجید نے اس قصہ کا انتخاب کیوں کیا؟
	غلو اور انتہا پسندی اس تہذیب کی	۴۴	مکہ کے اہل ایمان اور اصحاب کہف میں قدر و شکر
۶۹	خصوصیت ہے	۴۸	تایخ اپنے کو بار بار دہراتی ہے

۱۰۰	حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا قصہ	۷۰	عدل و اعتدال اس دین کا امتیاز ہے
۱۰۲	عجیب و غریب حالات	۷۳	دوبابغ والے کا قصہ
۱۰۴	حقائق کتنے عجیب ہوتے ہیں	۷۴	ادی نظریات اور ان کی کوتاہ نظری
	علم انسانی کمال اور حقیقت اشیاء	۷۶	ایمانی طرز فکر
۱۰۶	تمک نہیں پہنچ سکتا	۷۸	سورہ کی روح اور قصہ کی کلید
۱۰۷	ادی طرز فکر کو چیلنج	۷۹	ادی تہذیب کا اپنے وسائل و اسباب پر افتخار
۱۰۸	ذوالقرنین اور آسمانی پشتہ کی تعمیر	۸۰	ارادۃ الہی پر ایمان و اعتماد
۱۱۳	صالح اور مصلح بادشاہ	۸۲	دوبابغ والے کا شرک
۱۱۷	حکیم و دانامومن کی بصیرت اور نبی مجھ	۸۳	عہد حاضر کا شرک
	خالق کائنات سے بغاوت مغربی	۸۶	دنیا کی زندگی قرآن کی روشنی میں
۱۱۸	تہذیب کا مزاج ہے	۹۲	آسمانی مذاہب اور مادی فلسفوں کا فرق
۱۱۹	ادی تمدن کا نقطہ اختتام	۹۴	مدرسہ نبوت کے طالب علم اور ان کا کردار
۱۲۱	دجال کی علامت کفر و فساد اور تباہ کاری		جدید ذہنیت اور عقیدہ آخرت کی کمزوری
۱۲۳	زندگی اور معاشرہ پر دجال کا اثر	۹۶	نزع جانی
	وہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم بہت اچھا	۹۷	نبوت کی دعوت اور اصلاحی تحریک کا فرق
۱۲۵	کر رہے ہیں		قوت کا سرشتہ اور بہت پیش قدمی کا
۱۲۷	علم اور عقل انسانی کی کوتاہ نظری	۹۸	سب سے بڑا محرک
۱۳۰	نبوت کی ضرورت اور نبی کا امتیاز		ایمان بالآخرت اور رہبانیت میں کوئی
۱۳۱	آخری بات	۹۹	رشتہ نہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

پیش نظر کتاب ”معرکہ ایمان و مادیت“ راقم سطوح کی عربی کتاب ”الصواعق میں دارالعلم الايمان والمادية“ کا اردو ترجمہ ہے، یہ کتاب ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۱ء) میں دارالعلم کویت کی طرف سے شائع ہوئی، ترجمہ کی خدمت مصنف کی اکثر عربی کتابوں کی طرح اس کے برادر زادہ عزیز مولوی محمد اکسنی مدینہ البعث الاسلامی نے انجام دی، آیات کا ترجمہ زیادہ تر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ”ترجمان القرآن“ سے ماخوذ ہے، اس لئے کہ وہ ترجمہ کتاب کی زبان اور طرز تحریر سے زیادہ میل کھاتا تھا، جہاں ان کا ترجمہ نہیں ملا وہاں دوسرے تراجم قرآن مثلاً ”تفہیم القرآن“ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نیز حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

یہ کتاب کس طرح وجود میں آئی، اور اس کے مضامین اور مطالب کس طرح ارتقاء و تکمیل کی منزلوں سے گزرے، اس تفسیر و تشریح کی نوعیت کیا ہے، اس کے مضامین کے مآخذ کیا ہیں، اور کن حضرات کی تحقیقات اور غور و فکر سے اس میں مدد ملی، اس کا عصر حاضر کے حالات سے کیا تعلق ہے، اور اس سورہ سے کیا رہنمائی اور روشنی حاصل ہوتی ہے، ان سب سوالات کا جواب آپ خود اس کتاب میں پائیں گے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے

امید ہے کہ یہ کتاب اس سورہ کے علوم و حقائق پر غور کرنے اور قرآن مجید کے عام فہم و تدبر میں مدد دے گی۔ و ما توفیقی الا باللہ۔

ابوالحسن علی ندوی

دامرہ شاہ علم الشریعہ رائے بریلی

۲۳ محرم ۱۳۹۲ھ  
۱۰ مارچ ۱۹۷۲ء



## سورۂ کہف سے میرا تعارف

جمعہ کے روز جن سورتوں کے پڑھنے کا شروع سے میرا معمول ہے ان میں سورۂ کہف بھی شامل ہے، حدیث نبوی کے مطالعہ کے دوران مجھے علم ہوا کہ اس میں سورۂ کہف پڑھنے اور اس کو یاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کو دجال سے حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

لے یہ معمول دراصل میری والدہ صاحبہ مرحومہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، وہ ہمیشہ مجھے اس کی تاکید کرتی تھیں کہ جمعہ کے روز میں سورۂ کہف ضرور پڑھوں، وقتاً فوقتاً وہ میرا محاسبہ بھی کرتی رہتی تھیں کہ اس پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں؟ یہ سورہ مجھے اسی طرح پڑھتے پڑھتے یاد ہو گئی، والدہ مرحومہ خود حافظ قرآن تھیں، اور اپنے دینی مطالعہ اور ثقافت میں بھی ممتاز تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو شاعری کا بھی بہت اچھا اور پاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا، ان کی سنا جاتوں دعاؤں اور درود و سلام کے مجبورے ان کے یقین و اعتماد اور نزول کے ترجمان ہیں، اور شہری محاسن سے بھی خالی نہیں، جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ میں انتقال فرمایا۔

لے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس نے سورۂ کہف اس طرح پڑھی جس طرح وہ نازل ہوئی اس کے بعد دجال ظاہر ہو تو وہ اس پر قابو نہ پاسکے گا یا اس کو قابو میں لانے کا کوئی راستہ اس کو نہ مل سکے گا، (مستدرک للحاکم) ابن مردویہ اور محدث ضیاء نے مختارہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہر جمعہ کو سورۂ کہف پڑھے گا وہ آٹھ دن تک فتنے سے (باقی صفحہ ۱۰ پر)

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کیا اس سورہ میں واقعی ایسے معانی و حقائق اور ایسی تنبیہیں یا تدبیریں ہیں جو اس فتنہ سے بچا سکتی ہیں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بار بار پناہ مانگی ہے اور اپنی امت کو بھی اس سے پناہ مانگنے کی سخت تاکید فرمائی ہے اور جو وہ سب سے بڑا آخری فتنہ ہے جس کے بارہ میں حضور کا ارشاد یہ ہے کہ ما بین خلق ادم الى قيام الساعة امر اکبر من الدجال (آدم کی پیدائش سے قیام قیامت تک دجال سے بڑا کوئی واقعہ نہیں ہے)۔

میں نے سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جو کتاب اللہ اور اس کے اسرار و علوم سے سب سے زیادہ واقف تھے) قرآن کی ساری سورتوں میں آخر اسی سورہ کا انتخاب کیوں فرمایا ہے؟

### عہد آخر کے فتنوں سے سورہ کہف کا تعلق

مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل اس راز تک پہنچنے کے لئے مہتاب ہے، میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ اس خصوصیت کا سبب کیا ہے اور اس حفاظت اور بچاؤ کا جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، سورہ سے کیا معنوی تعلق ہے؟

(باقی ص ۹ کا) محفوظ ہے گا اور اگر دجال نکلا تو اس کے فتنہ سے بھی مومن رہے گا، حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو سورہ کہف کی دس پہلی آیتیں (ایکے دسری روایت میں آخری دس آیتوں کا ذکر ہے) پڑھے گا وہ دجال مسیح کے فتنہ سے محفوظ رہے گا“ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، آخر الذکر نے تین آیتوں کا ذکر کیا ہے) مسند احمد میں ہے کہ ”جو سورہ کہف کی آخری دس آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا“ (ج ۶ ص ۴۴۹-۴۵۰) نسائی میں ہے کہ ”جو سورہ کہف کی دس آیتیں پڑھے گا وہ اس کے لئے دجال سے امن و حفاظت کا ذریعہ بنے گی“ (اس مضمون کی کثرت احادیث وارد ہوئی ہیں)۔ لے صحیح مسلم (روایت عمران بن حصینؓ)

قرآن مجید میں چھوٹی بڑی (قصا، مفصل اور طویل مفصل) ہر طرح کی سورتیں موجود تھیں کیا وجہ ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر اس سورہ کا انتخاب کیا گیا اور یہ زبردست خاصیت صرف اسی سورہ میں رکھی گئی ہے۔

مجملاً مجھے اس کا یقین ہو گیا کہ یہ سورہ قرآن کی ضروری ایسی منفرد سورہ ہے جس میں ہمہ آثر کے ان تمام فتنوں سے بچاؤ کا سب سے زیادہ سامان ہے جس کا سب سے بڑا علمبردار دجال ہوگا۔ اس میں اس تریاق کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو دجال کے پیدا کردہ زہریلے اثرات کا ٹوڑ کر سکتا ہے اور اس کے بیمار کو مکمل طور پر شفا یاب کر سکتا ہے اور اگر کوئی اس سورہ سے پورا تعلق پیدا کر لے اور اس کے معانی کو اپنے جان و دل میں اتار لے (جس کا راستہ اس سورہ کا حفظ اور کثرت تلاوت ہے) تو وہ اس عظیم اور قیامت خیز فتنہ سے محفوظ رہے گا اور اس کے جال میں ہرگز گرفتار نہ ہوگا۔

اس سورہ میں ایسی رہنمائی، واضح اشارے بلکہ ایسی مثالیں اور تصویریں موجود ہیں

لے بہت سے علماء راہنہ اور صفت اول کے محققین و مفسرین نے اسی طرز فکر اور مسلک کو اختیار کیا ہے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سورہ کا دجالی فتنہ سے خاص معنوی تعلق ہے علامہ محمد طاہر ثقفی (م ۱۹۸۶ء) نے مجمع بحار الانوار میں بعض متقدمین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "حدیث میں سورہ کہف کی دجال سے حفاظت کے معاملہ میں بڑی فضیلت آئی ہے جو آخری زمانہ میں نکلے گا جس طرح اصحاب کہف کی اس ظالم بادشاہ سے حفاظت ہوئی یا ہر اس دجال سے جو فریب ملتے سازی اور تلبیس سے کام لے گا وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہوگا، وہ کہتے ہیں "میرے نزدیک اس کا یہ امتیاز کسی ایسی خاصیت اور تاثیر کی وجہ سے ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے" (مجمع بحار الانوار، مادہ "دجال")

جو ہر عہد میں اور ہر جگہ دجال کو نامزد کر سکتی ہیں، اور اس بنیاد سے آگاہ کر سکتی ہیں جس پر اس کا فتنہ اور اس کی دعوت و تحریک قائم ہے، مزید برآں یہ کہ یہ سورہ ذہن و دماغ کو اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے تیار کرتی ہے، اور اس کے خلاف بغاوت پر کساتی ہے اس میں ایک ایسی روح اور اسپرٹ ہے جو دجالیت اور اس کے علمبرداروں کے طرز فکر اور طریقہ زندگی کی بڑی وضاحت اور قوت کے ساتھ فہمی کرتی ہے، اور اس پر سخت ضرب لگاتی ہے۔

### سورہ کا صرف ایک موضوع ہے

اجمالی طور پر اس ذہن و خیال کو لے کر میں اس سورہ کی طرف اس طرح متوجہ ہوا، جیسے وہ میرے لئے بالکل نئی ہے، میں یہ چراغ (یعنی اس سورہ کے متعلق میرے ابتدائی ذہنی نقوش) لے کر اس کے مضامین و مشتملات کی جستجو میں نکل پڑا، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ معانی و حقائق کا ایک نیا عالم ہے جس سے میں اب تک نا آشنا تھا، میں نے دیکھا کہ پوری سورہ صرف ایک موضوع پر مشتمل ہے، جس کو میں ایمان و مادیت کی کشمکش یا غیبی قوت اور عالم اسباب سے تعبیر کر سکتا ہوں، اس میں جتنے اشارے، حکایات و واقعات اور مواظظا و تمثیلیں گزری ہیں، وہ سب انھیں معانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کبھی کھل کر، کبھی درپردہ۔

مجھے اس نئی دریافت یا نئی فتح سے بڑی مسرت حاصل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے اعجاز کا ایک نیا پہلو میرے سامنے آیا، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ کتاب جو چھٹی صدی عیسوی میں (یعنی آج سے تیرہ سو برس سے بھی زیادہ پہلے) نازل ہوئی اس دجالی تمدن و تہذیب کی (جو سترہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی اور اور پروان چڑھی اور بیسویں صدی میں پک کر تیار ہوئی) نیز اس کے نقطہ عروج اور اختتام

اور اس کے رہبر اعظم کی (جس کو نبوت کی زبان میں ”دجال“ کہا گیا ہے) ایسی سچی اور بولتی ہوئی تصویر انسانوں کے سامنے پیش کر دی گئی۔

آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد و تفسیر تھایہ صفاً و معانی ایک مقالہ کی شکل میں میرے قلم سے نکلے اور رسالہ ”ترجمان القرآن“ میں شائع ہوئے جو اس زمانہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ادارت میں حیدرآباد سے نکلتا تھا، اسی زمانہ میں مجھے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات کے صدر تھے قیام کا موقع ملا، یہ ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) کی بات ہے، میرا ہر رات کو مولانا سے علمی مذاکرہ ہوتا، انھوں نے ذکر کیا کہ مختصر مضمون ان کی نظر سے گزرا ہے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود اس موضوع پر (حسب معمول) بہت تفصیل کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اس کو اشاعت کے لئے ”الفرقان“ میں بھیجیں گے، مولانا کے انتقال کے موقع پر جب الفرقان کا ضخیم نمبر شائع ہوا تو یہ طویل مقالہ پورا اس میں شامل تھا۔

اس مقالہ نے جو اتنے زمانہ کے بعد شائع ہوا اس سورہ پر دوبارہ غور کرنے اور کچھ لکھنے کی تحریک پیدا کر دی اور یہ خیال ہوا کہ اس عظیم اور اہم سورہ کا عہد آخر کے فتنوں، تحریکوں، دعوتوں، فلسفوں اور فکری رجحانات اور خاص طور پر دجالی فتنہ سے جو تعلق ہے اس پر بروڈالی جائے اور اس کے اندر جو عبرتیں، اسباق، نشانیاں اور علامات پوشیدہ ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا میں نے اس کو قلمبند کرنا شروع کیا، مولانا گیلانی (جن کی باقاعدہ شاگردی کی سعادت سے میں محروم رہا لیکن ان کو اپنے اساتذہ و شیوخ میں سمجھتا رہا، اور وہ بھی ہمیشہ مجھے اپنا ایک عزیز بھائی سمجھتے رہے اور بہت شفقت و تعلق کا معاملہ فرماتے رہے) کے اس مقالہ میں نکات علمی، بلیغ اشارات اور لطائف قرآنیہ

کا جو قیمتی ذخیرہ تھا، اس سے مجھے بڑی مدد ملی، اس سورہ کے بارہ میں جو کچھ آگے آئے گا وہ مفسرین کے مخصوص طریقہ پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ صرف تاثرات اور واردات کا مرتق اور سورہ کہف کا ایک عمومی اور اصولی جائزہ ہے۔

## دجال کی شخصیت کی کلیہ

دجال کی شخصیت کی وہ کلیہ جس سے اس کے سارے بند نقل کھل جاتے ہیں اور اس کی گہرائیاں بھی سطح آب پر آ جاتی ہیں اور جو اس کو شر و فساد اور کفر و الحاد کے دوسرے نام علمبرداروں میں نمایاں کرتی ہے وہ یہی ”دجال“ کا مخصوص لقب اور وصف ہے جو اس کی پہچان اور علامت بن گیا ہے، دجل اور دجالیت ایسا محور ہے جس کے گرد اس کی پوری شخصیت اور اس کے تمام پروگرام، نظا ہرے سرگرمیاں اور اعمال گردش کر رہے ہیں اور اس کے ہر فعل پر اس کا سایہ ہے۔ عہد حاضر کی مادی تہذیب کا بھی سب سے بڑا حربہ یہی طمع سازی اور فریب کاری

لے ابن منظور نے سان العرب میں لکھا ہے کہ الدجال کے معنی جمل ساز اور جھوٹے کہ ہیں اور اسی سے دجال بنا یا گیا ہے، دجال کو مسیح کذاب بھی کہا گیا ہے اس لئے کہ اس کا دجل اس کا جھوٹ اور سحر ہے ابن خالویہ کہتے ہیں کہ دجال کی تشریح کسی نے اتنی اچھی نہیں کی جتنی ابو عمرو نے انھوں نے کہا کہ دجال جمل ساز اور طمع ساز کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ دجلت السیف یعنی تم نے تلوار پر طمع سازی کی اور اس پر سونے کا پانی چڑھا دیا، ازہری کہتے ہیں کہ ہر کذاب دجال ہے، دجل کسی نقلی چیز پر سونے کا پانی چڑھانے کو کہتے ہیں چنانچہ اسی لئے سونے کے پانی کو بھی دجال کہتے ہیں، دجال کو اس سے تشبیہ اس لئے دی گئی کہ وہ ظاہر کچھ کرے گا اندر کچھ ہوگا، ابو العباس کہتے ہیں دجال اس کو اس لئے کہا گیا کہ وہ لوگوں کو فریب میں ڈالے گا اور باطل کو خوشنما و آراستہ کر کے پیش کرے گا۔ (سان العرب باختصار)

ہے، اور اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے کسی چیز کو اس کے اثر سے آزاد نہیں چھوڑا۔  
 حقائق کچھ اور ہوتے ہیں، نام ان کے برعکس رکھے جاتے ہیں، اصطلاحات اور پر شکوہ الفاظ کا  
 بکثرت رواج ہے، ظاہر و باطن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، آغاز و انجام، تنہید  
 و اختتام، علمی نظریات اور عملی تجزیوں میں یکسانیت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، یہی حال  
 ان فلسفوں اور نعروں کا ہے، جنہوں نے مذاہب کی جگہ لے لی ہے، اور انسانوں کے دل و دماغ  
 کو مسحور کر رکھا ہے، اس کے زعماء کے اقوال و بیانات کے گرد تقدیس کا ایک ہال قائم کر دیا  
 گیا ہے، اور ان کی عقیدت و محبت دل میں تہ نشین ہو چکی ہے، ان کے افکار و خیالات کی برتری  
 و بالا تری اور عصمت و تقدس میں شبہ کرنا رجعت پسندی کی علامت امر بدیہی اور محسوس و شہو پس  
 کا انکار سمجھا جاتا ہے، اور بڑے بڑے ذہین و فکری اعلیٰ درجہ کے اہل علم اور غیر معمولی صلاحیت  
 کے اہل فکر و نظر بھی اس معاملہ میں مغالطہ اور فریب نظر کا شکار ہیں، اور وہ بھی ان فلسفوں اور  
 تحریکوں کے گن گانے لگے ہیں، اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں، وہ اس کے علمبرداروں اور  
 لیڈروں کے جذبہ اخلاص اور صداقت کا امتحان لئے بغیر بڑے یقین و گرجوشی کے ساتھ  
 اس کے داعی بن چکے ہیں، اور اخلاقی جرأت کے ساتھ ان کی کامیابی اور ناکامی کا حساب لگائے

---

لے حدیفہ بن الیمان سے مروی ہے کہ نہ دجال اس طرح نکلے گا کہ اس کے ساتھ آگ اور پانی ہوگا جس کو لوگ  
 پانی سمجھیں گے وہ جلانے والی آگ ہوگی جس کو آگ سمجھیں گے وہ شیریں پانی ہوگا، (مسلم، کتاب افتن  
 و انشاء الساعۃ) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اس کے ساتھ جنت و دوزخ کی طرح کوئی چیز  
 ہوگی جس کو وہ جنت بتائے گا وہی دراصل دوزخ ہوگی، (مشکوٰۃ، حیرت، انشراکیت، جہولیت، میلازنگی  
 کی بلندی، معاشی خوشحالی، فلاحی ریاست، انسانی حقوق، یہاں تک کہ تمدن و تہذیب، فنون لطیفہ اور  
 قانون و دستور صحیہ الفاظ صرف نعروں کے طور پر استعمال کئے جا رہے ہیں۔

بغیر اور ان نظریات کے نتیجے میں انسانیت کے نفع و نقصان کا غیر جانبدارانہ اور صحیح جائزہ ملے بغیر اس کے ہمنوا اور ہم آواز ہیں اور یہ دیکھنے کے روادار نہیں کہ ان تحریکوں کے نتیجے میں حقیقی کامیابی اور فطری حقوق انسانیت کو حاصل ہوتے بھی ہیں یا نہیں؟ یہ سب سی دجل و فریب کا اثر اور سحر ہے جس میں دجال کبر اپنے پیشرو چھوٹے دجالوں، فریب کاروں اور ملمع سازوں سے آگے ہوگا، خواہ وہ تاریخ کے کسی دور میں گزریں ہوں۔

یہ دجالی اور پرفریب روح اس تہذیب میں اس وجہ سے داخل ہوئی اور سرایت کر گئی کہ اس نے بھی نبوت، آخرت، عجب، خالق کائنات اور اس کی قدرت کا ملہ پر ایمان اور اس کی شریعت و تعلیمات کا بالکل مخالف رخ اختیار کیا، جو اس ظاہری پرزیاہ سے زیادہ بھروسہ کیا اور صرف ان چیزوں سے دلچسپی رکھی جو انسان کو جسمانی لذت، فوری منفعت اور ظاہری عروج و غلبہ سے ہمکنار کر سکیں اور یہی وہ نقطہ ہے جس پر سورہ کہف میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس میں جتنے عبرت انگیز واقعات و خدائے گزشتہ ہیں وہ اسی مرکزی نقطہ سے وابستہ ہیں اور ایک لڑی میں پیوست ہیں۔

**تہذیب و تمدن کی تشکیل اور انسانیت کی رہنمائی میں عیسیٰ و یہود کا ملتا جلتا کردار**

ہمیں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرنا پڑے گا کہ عیسائیت (جس نے قرونِ ماضیہ کے بعد یورپ کی قیادت کی) اور جذبہ انتقام میں سرشار باغی یہودیت کا کردار (عقائد میں بنیاد کا اختلاف کے باوجود) بہت ملتا جلتا رہا ہے اور دونوں مذاہب تہذیب انسانی کا رخ ایسی مکمل اور انتہا پسندانہ مادیت کی طرف پھیرنے میں جو انبیاء کی تعلیمات اور روحانیت سے بالکل آزاد ہو اور انسانیت کے مستقبل پر اثر انداز ہونے میں برابر کے شریک کار اور ذمہ دار رہے، عیسائی اقوام نے جو کلیسا اور یورپ کی بالادستی سے آزاد ہو چکی تھیں اور جن کا رشتہ اصلی عیسائیت سے (جو صلہ پسند اور



توحید خالص کی داعی تھی) اگر منقطع نہیں تو کمزور ضرور ہو گیا تھا، تیز رو اور انتہا پسندانہ مادی  
ریح اختیار کیا، اور بالآخر جدید علمی اکتشافات اور تباہ کن ایجادات کے نتیجہ میں پوری دنیا اور  
انسانیت ایک عظیم خطرہ سے دوچار ہے اور علم و جذبات عقل و ضمیر اور طبیعت و اخلاق کے  
درمیان توازن اور ضروری تناسب یکسر مفقود ہو چکا ہے۔

عہدِ آخر میں یہودیوں نے (مختلف اسباب کی بنا پر جن میں بعض ان کے نسلی خصائص سے  
تعلق رکھتے ہیں، بعض تعلیم و تربیت سے بعض سیاسی مقاصد اور قومی منصوبوں سے) علم و فن اور  
ایجادات و اختراعات کے میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، انھوں نے ایک طرح سے تہذیبِ جدید  
پر پورا کنٹرول کر لیا، اور ادب و تعلیم، سیاست و فلسفہ، تجارت و صحافت اور قومی رہنمائی کے سارے  
وسائل ان کے ہاتھ میں آ گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مغربی تہذیب (جو مغربی ماحول میں  
پیدا ہوئی) کے ایک اہم ترین عنصر کی حیثیت حاصل کر لی، جدید تغیرات کا جائزہ لینے سے ہیں اندازہ  
ہو گا کہ بین الاقوامی یہودیت کا اثر و رسوخ مغربی معاشرہ میں کس قدر بڑھ چکا ہے، اب یہ تہذیب اپنے  
تمام سرمایہ علم و فن کے ساتھ اپنے منفی انجام کی طرف بڑھ رہی ہے اور تخریبِ فساد اور تلبیس و دجل  
کے آخری نقطہ پر ہے، اور یہ سب ان یہودیوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے، جن کو اہلِ غربت نے سر آنکھوں پر  
بٹھایا اور ان کے دور رس خفیہ مقاصد انتقامی طبیعت اور تخریبی مزاج سے غافل رہے، پرواہ ہو کر ان کی  
جڑوں کو اپنے لٹکوں میں خوب پھیلنے اور گہرا ہونے کا موقع دیا، اور ان کے لئے ایسی سہولتیں اور مواقع  
فراہم کئے جو طویل صدیوں سے ان کے خوابِ خیال میں بھی نہ آسکے ہوں گے، یا انسانیت کا سب سے بڑا انتقام  
ہے اور نہ صرف عربوں کے لئے (جو ان کو بھگت رہے ہیں) اور نہ صرف اس محدود درجہ کے لئے  
جہاں موت و ذلالت کی کیشکش برپا ہے، بلکہ ساری دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

غالباً ان ہی وجوہ کی بنا پر اس سورہ کا عیسائیت و یہودیت سے گہرا تعلق ہے، بلکہ سوچا

آغاز ہی عقیدہ عیسائیت کے ذکر سے ہو رہا ہے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهٖ  
اَلْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّدَیْهِ عِوَجًا فِیْمَا  
لَیْسَ رِیْبًا سَاسِدًا یُّدْرِیْ اَمُّنٌ لَّدُنْهُ  
وَلَیْسَ بِرِیْبٍ اَلْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ  
الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا  
مَا لَیْسَ فِیْهِ اَبَدًا وَیُنْزِلُ الَّذِیْنَ  
قَالُوْا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا مَا لَهُمْ بِهِ  
مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِابْنِہُمْ کُلُوْتٌ کَلِمَةً  
تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِہُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْنَ  
اِلَّا کَذِبًا

(سورہ کہف آتا ۵)

(ایسی سخت بات منہ سے نکالی کہ) کہا اللہ بھی

اولاد رکھتا ہے! اس بے مہر بھیس کوئی علم

نہیں نہ ان کے باپ ادوں کے پاس کوئی

علم تھا کیسی سخت بات ہے جو ان کی زبانوں سے

نکلتی ہے یہ کچھ نہیں کہتے، مگر سزا سچھوٹ!

اس تہذیب کی جو عیسائیت کی گود میں پئی اور بڑھی اور اس کی سرپرستی میں پروان چڑھی

دوسری پہچان یا خصوصیت اس محدود و فانی زندگی سے جس سے بڑھا ہوا تعلق، اس کو زیادہ

سے زیادہ آرام دہ اور طویل بنانے کا شوق، اس کی غفلت میں غلو و مبالغہ اور اس کے سوا تمام

اخلاقی قدروں، عظمتوں اور نعمتوں کی نفی، اور مادی اسباب و وسائل اور ذخائر پر قبضہ و اقتدار پر انحصار اور اس میں مکمل انہماک اور استغراق ہے، یہ وہ نقطہ ہے، جہاں یہودیت اپنی ساری عیسائیت دشمنی اور رقابت کے باوجود اس کے ساتھ آکر شریک ہو گئی ہے۔

توریت بھی اخروی زندگی پر یقین اور اس کے لئے تیاری، عالم آخرت کی ابدی سعادت کے حصول کے لئے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے استعمال اور حجت کی نعمتوں اور خدا کے انعام کا ذوق و شوق پیدا کرنے والی چیزوں کے بیان، اس دنیا کی بے حقیقی اور عمر کی بے ثباتی کی تشریح، اقتدار پرستی اور توسیع پسندی کے جذبہ کی مذمت، زمین میں تخریب و فساد کی ممانعت، زہد و قناعت اور دنیا و متاع دنیا سے کم سے کم وابستگی کی دعوت، اس طرح خالی ہے کہ حیرت ہوتی ہے اس کا طرز ان آسمانی صحیفوں کے طرز سے بالکل جدا نظر آتا ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں اور جن کی اصل روح محبت دنیا کی مذمت اور آخرت کی دعوت ہے۔

اس لحاظ سے اگر یہودیت کی تاریخ صرف مادی قوت، رقابت و مسابقت، دولت کی ہوس، نسلی غرور، اقتدار پرستی اور قومی تکبر کی تاریخ میں ڈھل گئی ہے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، یہ ذہنیت یہود کی مذہبی کتابوں، ان کے ادب و لٹریچر، ان کی ایجادات و اختراعات، ان کے انقلابات و تحریکات اور افکار و خیالات ہر چیز سے عیاں ہے اور نرم دلی، تواضع، ضبط نفس، خود شکنی، دنیاوی زندگی سے بے رغبتی، اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق، آخرت کی طلب اور انسانیت پر رحم و شفقت کا کوئی شاہد ان کے قومی نظام میں نہیں پایا جاتا۔

اسی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سورہ میں شرک اور فرزندگی کے عقیدہ کی جو عیسائیت کی طرف منسوب ہے سخت مذمت فرمائی ہے، اور دنیاوی زندگی کی پرستش اس کو ہمیشہ کا گھر سمجھنے، اور ہر چیز سے کٹ کر اس میں مست و بنحو درہنہ پر سخت تنبیہ کی ہے اور اس کی

بنیادی کمزوری اور بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً  
لَهَا لِيَبْلُوَهُمْ آيَاتِهِمْ أَحْسَنَ عَمَلًا  
وَإِنَّا لَإَعْلَمُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا  
جُزْأًا

رُئے زمین میں جو کچھ بھی ہے اسے ہم نے زمین کی  
نوشٹائی کا موجب بنایا ہے اور اس نے بنایا  
ہے کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں کون ایسا  
ہے جس کے کام سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں

(سورہ کہف - ۷-۸)

(ناپود کر کے) چٹیل میدان بنا دیتے ہیں۔

دنیا کے پرستاروں، منکرین آخرت اور اہل غفلت پر تکبر کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا  
الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَّهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا  
وَهُمْ يُجْزَوْنَ أَثَمَهُمْ يُجْزَوْنَ  
صُنْعًا

(اے پیغمبر!) ان کو کہہ دے ہم تمہیں خبر دے دیں  
کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ ناکام  
ہوئے؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی  
میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے

(سورہ کہف - ۱۰۳-۱۰۴)

ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں!

اسی طرح عقیدہ آخرت ایمان بالغیب اور خالق کا مشا اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایمان ہونے  
کے اول و آخر بلکہ اس کے تمام حصوں پر محیط ہے، یہ وہ عقیدہ نفسیات، عقلیت اور مزاج ہے،  
جو ادیت کے مزاج و نفسیات سے یکسر مختلف ہے، اس کے برعکس مادیت (جو صرف جس مشاہدہ اور  
تجربہ پر اعتماد کرتی ہے) اور دنیاوی منفعت جہانی لذت اور قومی و نسلی سیادت و برتری کی قائل  
ہے) اس سے اباکرتی ہے اور اس سے متنفر ہے، بلکہ اپنی پوری قوت و صلاحیت کے ساتھ اس سے  
برسرِ بریکار ہے، یہ سورہ جس مادہ اور جو ہر مشتمل ہے اس کے اندر اس مادیت کا تریاق پہلے سے

موجود ہے جو تقدیر الہی سے سب سے زیادہ عیسائیوں کے حصہ میں آئی اور پوری تاریخ میں وہ اس کے سب سے سرپرست داعی اور نگراں و ذمہ دار ثابت ہوئے اس کے بعد اس کی تولیت و قیادت یہو کے ہاتھ میں رہی جو حضرت مسیح کے شروع سے دشمن اور ہر دور میں مسیحیت کے رقیب تھے اور اب ان ہی یہودیوں کے ہاتھوں یہ ہندیر لپنی آخری بلندیوں تک پہنچے گی اور ان ہی میں دجال کبر ظاہر ہوگا جو کفر و اتحاد اور جہل و تمسک کا سب سے بڑا علمبردار اور سارے دجالوں کا سردار ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”اس سورہ اور خاص طور پر اس کے ابتدائی حصہ کی تلاوت اس کے فتنہ سے محفوظ رکھتی ہے“ اس طرح سورہ کے آغاز و اختتام کے درمیان ایک ایسی لطیف مناسبت قائم ہو گئی ہے جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے مجموعی طور پر سورہ کا تعلق فتنہ دجال سے بہت گہرا ہے اور اس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

## سورہ کہف کے چار قصے

یہ سورہ چار قصوں پر مشتمل ہے جو اس کے سنگ میل یا ستون کہے جاسکتے ہیں دوسرے الفاظ میں یہ وہ محور ہیں جن کے گرد اس کی ساری تعلیم و موعظت اور دانش و حکمت گردش کر رہی ہے۔

۱۔ اصحاب کہف کا قصہ۔

۲۔ صاحب الجنتین (دو باغ والے) کا قصہ۔

۳۔ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قصہ۔

۴۔ ذوالقرنین کا قصہ۔

یہ قصے جو اپنے اسلوب بیان اور ساق و سباق کے لحاظ سے جدا ہیں مقصد اور روح کے لحاظ سے ایک ہیں اور اس روح نے ان کو معنوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور

ایک لڑی میں منسلک کر دیا ہے۔

## کائنات کے دو نظریے!

یہ کائنات (عام حالات میں) طبعی اسباب و محرکات کی تابع ہے اور یہ اسباب میں اپنا کام کر رہے ہیں یہ وہ کائناتی طاقتیں ہیں جو اس کے نظام پر حاوی اور اس کے اندر جاری و ساری ہیں یہ اسباب اور خواص اشیاء کبھی شاذ و نادر ہی اپنی خاصیت و تاثیر چھوڑتے ہیں یا ان کا نشانہ غلط ہوتا ہے اب لوگوں کی ایک تعداد وہ ہے جن کی نگاہ ان ظاہری اور قدرتی اسباب سے پیچھے نہیں گئی بلکہ اسی زندگی اور مادی اور محسوس دنیا میں اٹک کر رہ گئی، وہ سمجھنے لگے کہ نتائج ہمیشہ اسباب ہی سے وجود میں آسکتے ہیں اور اسباب کے بغیر نتائج کا تصور ناممکن ہے اور پوری کائنات میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو اسباب نتائج کے درمیان حائل ہو سکے اور اپنے آزادانہ ارادہ کے ساتھ ان میں کوئی تبدیلی کر سکے اور بغیر اسباب کے مسببات کو وجود میں لاسکے اور ان کو بلا کسی تمہید مدد اور سہارے کے پیدا کر سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گروہ ان اسباب ظاہری میں پھنس کر رہ گیا اور ان کے ساتھ اس نے خدا کا سامنا کرنا شروع کر دیا اشیاء کی خاصیتوں اور اسباب و وسائل کے سوا اس نے ہر چیز سے انکار کیا، اس نے اس قوت کا انکار کیا جو اس کائنات کی بلا شرکت غیرے مالک و حاکم ہے اور اس کا حکم ساری دنیا پر نافذ ہے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی اور حشر و نشر کا بھی اس نے انکار کیا اور اپنی ساری قوت و صلاحیت کائنات کی ان طبعی طاقتوں کی تسخیر اسباب خواص کی دریافت اور مادی وسائل کے استعمال میں صرف کر دی اور اس کی فکر و آرزو اور تلاش و جستجو میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ ان چیزوں کی عظمت اور محبت اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی، اور اس کو اس نے اپنا رب اور اپنا معبود بنا لیا، مادہ اور

قوت کے سوا وہ ہر چیز کا منکر ہو گیا، جب مقصد کی تکمیل اس کو آنکھوں سے نظر آنے لگی اور اس نے بعض چیزوں کو اپنے ارادہ کے تابع کر لیا اور اپنے تصرف و استعمال میں لے آیا تو اس نے کبھی زبان حال سے اور کبھی زبان قال سے اپنی الوہیت و ربوبیت کا بھی اعلان کرنا شروع کیا اپنے جیسے انسانوں کو اپنا بندہ اور غلام بنایا، ان کے خون، مال اور عزت و آبرو کے ساتھ جس طرح چاہا کھل کھیلایا، اور اپنے اغراض و خواہشات نفسانی اور اپنی سر بلندی و ناموس کی لئے یا اپنی قوم کی عظمت کے نام پر، وطن کے نام پر اور پارٹی کے نام پر ان مظلوم انسانوں کے ساتھ جو چاہا سلوک کیا۔

اس کائنات کا دوسرا نظریہ پہلے نظریہ سے بنیاد اور طریقہ کار ہر چیز میں مختلف ہے، یہ نظریہ اس یقین پر قائم ہے کہ الٰہی استیلا، قدرتی طاقتوں اور خزانوں اور اشیاء کی خاصیتوں کا اور اور بالاتر ایک غیبی قوت ہے جس کے ہاتھ میں ان اسباب خواص کی زمام اقتدار ہے اور جس طرح نتائج و خرات اسباب کے تابع ہیں اسی طرح خود یہ اسباب اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت اور حکم و اشارہ کے تابع محض ہیں، ارادہ الٰہی ان کو عدم سے وجود میں لاتا ہے، ان کو آگے بڑھاتا اور چلاتا ہے، اور جب چاہتا ہے ان کو مسببات سے جدا کر دیتا ہے، اس لئے کہ اسباب مسببات دونوں یکساں طریقہ پر اس کے تابع و فرمانبردار ہیں، وہ خود مسبب الاسباب اور علۃ العلل ہے اور اسباب اور علل کا سارا سلسلہ اسی کی ذاتِ عالی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

کائنات کو پیدا کرنے اور اسباب کو وجود میں لانے کے بعد کائنات کی زمام ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی، اور سلسلہ اسباب اس کی غلامی سے ایک لمحہ کے لئے آزاد نہیں ہوا، نہ اس نے اس سے سترائی کی، نہ کبھی اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، آسمان و زمین کی کوئی چیز اس کو عاجز کرنے پر قادر نہیں اسی نے اپنی حکمت بالغہ اور ارادہ قاہرہ سے اشیاء کو خواص سے اور

سببات کو اسباب سے اور مقدّمات کو نتائج سے وابستہ کیا، وہی جو طے والا اور توڑنے والا ہے، مٹانے والا اور بنانے والا ہے، اور وہی تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لاتا اور لباس ہستی پہناتا ہے:-

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ  
لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝

تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جائے وہ

(سورہ یسین - ۸۲) ہو جاتی ہے۔

اس کے سامنے یہ حقیقت اچھی طرح آگئی کہ اس کائنات میں کچھ اور عوامل و محرکات ہیں جو افراد و اقوام کی تقدیر پر اس سے کہیں زیادہ اثر انداز ہیں، جتنے کہ یہ طبعی اور ظاہری اسباب، اسی طرح ان سے جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں، وہ ان طبعی اور مادی نتائج سے بہت زیادہ انقلاب انگیز ہوتے ہیں، جو اسباب سے وابستہ و مربوط ہیں۔

یہ عوامل و محرکات ایمان و عمل صالح، اخلاق عالیہ، خدا کی اطاعت و عبادت، عدل و انصاف، رحم و محبت اور اسی طرح کے دوسرے معنوی اسباب ہیں جو کفر و بغاوت، فساد فی الارض، ظلم و نفس پرستی اور گناہوں و معصیّتوں جیسے معنوی اسباب کے بالکل برعکس کام کرتے ہیں۔

اسباب طبعی کو ترک کئے بغیر اگر کوئی ان صالح معنوی اسباب کو اختیار کرے گا تو یہ کائنات اس سے مصاحبت کرنے پر مجبور ہوگی، اور زندگی اپنی حقیقی لذت و صلاحات کے ساتھ اس کا ساتھ دے گی، اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں سہولتیں اور آسانیاں پیدا فرمائے گا، اور بعض موقعوں پر اسباب طبعی بھی اس کے پابند کر دیئے جائیں گے، اور خارق عادت چیزیں ظاہر ہونے لگیں گی، اس کے برعکس جو دوسرے قسم کے غیر صالح اسباب اپنا تعلق رکھے گا اور صرف طبعی قوتوں پر اعتماد کرے گا، اور اپنی پوری زندگی اسی بنیاد پر قائم کرے گا تو یہ کائنات اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے گی، جو طاقتیں اس نے اپنے تابع کر لی ہیں، وہ بھی اس کو دھوکہ دینے



لگیں گی، وہ ہر لمحہ ان کی احتیاج میں رہے گا، اور یہ احتیاج برابر بڑھتی جائے گی، قدرت اس کے خلاف ہوگی، اور طبعی قوتیں اس کی راہ میں مزاحم ہوں گی۔

## سورۃ کہف ایمان اور مادیت کی کشمکش کی کہانی ہے

سورۃ کہف دو نظریات، دو عقیدوں اور دو قسم کی نفسیات کی کشمکش کی کہانی ہے، ایک مادیت اور مادی چیزوں پر عقیدہ، دوسرے ایمان بالغیب اور ایمان باللہ، اس میں ان عقائد اعمال و اخلاق اور نتائج و آثار کی تشریح کی گئی ہے، جو ان دونوں قسم کی نفسیات یا نظریات کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اس اول الذکر نظریہ کو اختیار کرنے کے خلاف آگاہی دی گئی ہے، جو صرف مادہ اور اس کے مظاہر پر یقین رکھتا ہے، اور خدا اور غیبی قوتوں کا منکر ہے۔

## اصحاب کہف کا قصہ

اب ان چاروں قصوں کی طرف آئیے، سب سے پہلے جو قصہ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اصحاب الکہف والقریم کا قصہ ہے، یہ اصحاب کہف کون تھے، انسانی تاریخ میں اس قصہ کی کیا قیمت و افادیت ہے، اور قرآن مجید نے اس خصوصیت و اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر کیوں کیا ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید کہانی بن گیا، اور اس کو تاریخ کے ہر دور میں برابر سنایا جاتا رہا؟

مسیحی لٹریچر اور مذہبی کہانیوں میں اصحاب کہف کا تذکرہ

قبل اس کے کہ ہم اس قصہ کو قرآن مجید کے مخصوص معجزانہ اسلوب، با مقصد و

باقار اندازِ کلام اور اس بلاغتِ قرآنی کے آئینہ میں دیکھیں جو غیر ضروری باتوں اور فضول بحثوں سے پاک اور بالاتر ہے، ہم پہلے قدیم مذہبی صحیفوں اور ان روایتی داستانوں میں اس کا سراغ لگاتے ہیں جو سینہ بسینہ چلی آرہی ہیں اور جس کو ایک نسل دوسری نسل تک منتقل کرتی آئی ہے، اس کے بعد ہم اس کا جائزہ لیں گے کہ اس داستان اور قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ میں کہاں کہاں اشتراک ہے اور کس جگہ اختلاف!

اصحابِ کہف کا ذکر عہدِ عتیق کے صحیفوں میں نہیں ہے اس لئے کہ یہ واقعہ عیسائی تاریخ کے آغاز میں اس وقت پیش آیا جب لوحِ اور بت پرستی چھوٹنے کی دعوت مسیح علیہ السلام کے تبعین کے ذریعہ پھیل چکی تھی اور عہدِ عتیق کے آخری صحیفے بھی مرتب ہو چکے تھے، اس قصہ میں قدرتی طور پر (خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس میں حضرت مسیح کے تبعین کی جو انفرادی واستقامت پوری طرح عیاں ہے) کوئی ایسی چیز نہ تھی جو یہودیوں کو اس کے حفظ و نقل پر آمادہ کرتی، البتہ عیسائیوں کے لئے یہ بہت محبوب پسندیدہ مذہبی قصوں میں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ نسبت اور قصوں کے اس میں زیادہ حیرت انگیز اور کپش و واقعات بیان کئے گئے تھے، مزید یہ کہ اس واقعہ سے مسیح علیہ السلام کے ابتدائی ماننے والوں کی مضبوطی واستقامت ان کی قوتِ ایمانی اور عقیدہ و اصول کے لئے ان کی خود شکنی و قربانی اور مسیحیت کی اولین صاف و پاکیزہ تعلیمات کی خاطر ان کی غیرت و حمیت کا بڑا ثبوت ملتا تھا، اور وہ آج بھی ایمان کی دلی ہوئی چمکاری کو دوبارہ فروزاں کرنے سوئی ہوئی غیرتِ ایمانی کو بیدار کرنے، مزاحمت اور مقابلہ کی طاقت پیدا کرنے اور جدوجہدِ قربانی کے راستہ پر ڈلنے کی قوت و صلاحیت رکھتا ہے، یہ عناصر جو اس قصہ کی انتیازی خصوصیت ہیں، طویل انسانی تاریخ میں اس کے بقا و دوام کے ضامن ہیں اور اسی وجہ سے اس کو رئے زمین کے

اتنے بڑے رقبہ اور علاقوں میں شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، اور ایک عہد سے دوسرے عہد اور ایک نسل سے دوسری نسل تک اس کو برابر منتقل کیا جاتا رہا، اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ زمانہ سابق کے عیسائیوں نے اس کو کس طرح سمجھا تھا، اور بعد کے آنے والوں کے لئے اس سلسلہ کی کیا معلومات بہم پہنچائی تھیں؟

اس سلسلہ میں اخلاق و مذاہب کے انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل حسب ذیل ہے:-

”سات سونے والوں (SEVEN SLEEPERS) کا قصہ مقدس ہستیوں کے ان قصوں میں ہے جس میں عقل کی تسلی و آسودگی کا سب سے زیادہ سامان ہے، اور جو آفاق عالم میں سب سے زیادہ مشہور ہے، قصہ کے عناصر جو قدیم ترین کتابوں میں نظر آتے ہیں حسب ذیل ہیں:-

”شہنشاہ ڈیسس (DECIUS) یونان کے قدیم شہر ایفسس (EPHESUS) میں جا کر

”مشہور انگریز۔۔۔ مورخ اڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے اپنی مشہور کتاب (DECLINE - AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں اس قصہ کا اپنے خاص اسلوب میں ذکر کیا ہے جس میں ادب و تاریخ اور تبصرہ و تشریح ہر چیز کی آمیزش ہے اور جس میں عیسائیت کے لئے اس کا کھلا ہوا تصب اور اسلام پر غیر ضروری اور بے موقع چوٹیں خوب نمایاں ہیں۔ دیکھئے ص ۲۳۱ - ۲۳۳ جلد دوم

(MODERN LIBRARY GIANT SERIES (U.S.A)

”اگر مفسرین مثلاً بیضاوی، نیشاپوری، آلوسی اور ابن کثیر نے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ یہ شہر ایفسس تھا، اکثر مورخین اور عیسائی جغرافیہ دانوں کا بھی یہی خیال ہے گبن (GIBBON) نے بھی اپنی کتاب ”زوال روم“ میں اسی سے اتفاق کیا ہے (دیکھئے سات سونے والوں (SEVEN SLEEPERS) کا قصہ)

”جہاں تک اس مقام کے جغرافیائی تعین کا تعلق ہے بتالی کے دائرۃ المعارف نے یہ لکھا ہے کہ یہ انطاولیہ کے بارہ الہی شہروں میں سے ایک ہے، اس کا عملی وقوع نہر قسطنطنیہ کے جنوبی سمت میں ہے اور وہ ازیر سے ساٹھ کلومیٹر کی مسافت پر ہے، رومیوں نے اس کو مغربی ایشیا کی ریاست کا پایہ تخت بنایا تھا، اور وہ بہت بڑا بارونق تجارتی مرکز تھا لیکن اس کے فخر کے لئے سب سے بڑی چیز یونانی دیوی ڈیانا کا وہ عظیم مجسمہ جو دنیا کے سائے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے اور سب سے بڑا یونانی بت ہے، بلکی (BLACKIE) نے (اپنی کتاب (بالی مشہور)

بت پرستی کی رسم کی تجدید کرنا چاہتا ہے اور باشندگان شہر یا مخصوص عیسائیوں کو بتوں پر قربانی پیش کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کے نتیجے میں عیسائی عیسائیت ترک کر دیتے ہیں اور ایک تعداد اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہتی ہے اور حکومت کے مظالم برداشت کرتی ہے اس موقع پر سات نوجوان (بعض روایات میں ان کی تعداد آٹھ بتائی گئی ہے) جو محل شاہی میں مقیم تھے، بادشاہ کے سامنے آتے ہیں (ان کے ناموں میں اختلاف ہے) ان پر اس کا الزام ہے کہ وہ خفیہ طور پر عیسائیت قبول کر چکے ہیں یہ نوجوان بتوں کے لئے قربانی سے انکار کرتے ہیں بادشاہ ان کو اس موقع پر ایک مدت کی ہملت دیتا ہے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں اور نصرا نیت سے توبہ کر لیں اس کے بعد وہ شہر سے چلا جاتا ہے۔

اس مدت میں یہ نوجوان شہر چھوڑ دیتے ہیں اور ایک قریب پہاڑ میں جا کر جس کا نام (ANCHILUS) ہے ایک غار میں چھپ جاتے ہیں ان میں ایک جس کا اصلی نام (DIOMEDES) تھا، لیکن اپنے چھپانے کے لئے اس نے اس نام کو بدل کر (LAMBICHUS) رکھ لیا تھا، پھٹے اور میلے کپڑوں میں شہر جاتا ہے تاکہ حالات کا پتہ لگائے اور اپنے ساتھ کھانا بھی لیتا آئے اس پر کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ شاہ ڈیسس پھر شہر میں واپس آ جاتا ہے اور حکم جاری کرتا ہے کہ نوجوان اس کی خدمت میں حاضر کئے جائیں (DIOMEDES) اپنے ساتھیوں کو اس شاہی حکم سے آگاہ کرتا ہے وہ کھانا کھاتے ہیں اور بڑے فکر و قلق میں پڑ جاتے ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک طویل اور گہری نیند ان پر مسلط کر دیتا ہے، جب ان نوجوانوں کا پتہ نہیں لگتا تو ان کے والدین کے طلب کیا جاتا ہے وہ اس فراز سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں اور اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا اس سازش (باقی صفحہ ۲۹ کا) (A MANUAL OF BIBLE HISTORY) میں لکھا ہے کہ انیس کا شہر تاریخ قدیم میں اپنے فلسفہ اپنے باشندوں کی بے قیدی دلیہ حیاتی میں مشہور اور بڑا اخلاقی اور فتن و فحور میں ضرب المثل تھا، اس کی بت پرستی میں مغربی و مشرقی دونوں قسم کی بت پرستی کی آمیزش تھی۔

میں کوئی ہاتھ ہے وہ بادشاہ کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ (ANCHILUS) کے پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں، بادشاہ حکم دیتا ہے کہ غار کا منہ ایک بڑے پتھر سے بند کر دیا جائے تاکہ وہ اس میں اپنی موت مر جائیں اور اسی غار میں دفن رہیں، دو عیسائی جن میں ایک کا نام (THEODORE) اور دوسرے کا (RUFINUS) تھا، ان شہید نوجوانوں کا قصہ جستہ کی ایک تنہی پر لکھ کر نیچے دبا دیتے ہیں جس سے غار کا منہ بند کیا گیا تھا۔

تین سو سات سال کے بعد شاہ تھیوڈوسس (THEODOSIUS) ثانی کے عہد میں ایک بغاوت ہوئی ہے جس کی قیادت بعض عیسائی کرتے ہیں، ایک جٹا جس کے رہنما پادری تھیوڈور (THEODORE) ہیں حیات بعد الموت اور شہر اجساد کا انکار کرتے ہیں عیسائی بادشاہ اس بات سے خوف زدہ اور فکر مند ہوتا ہے اس موقع پر الشتر تلے ایک رئیس (جس کا نام (ADOLPHUS) ہے) کے دل میں ڈالتا ہے کہ وہ اپنی کبریوں کے گلہ کے لئے اس میدان میں ایک باڑھ تیار کرے جہاں یہ غار واقع تھا ہمارا اس کی تعمیر کے لئے اس پتھر کا بھی استعمال کرتے ہیں جس سے غار کا منہ بند تھا، اس طرح یہ غار کھل جاتا ہے اس وقت الشتر تلے ان نوجوانوں کو بیدار کر دیتا ہے، ان کے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ شاید صرف ایک رات سوئے ہیں وہ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو انھیں ڈیسیس (DECIUS) کے ہاتھوں شہادت قبول کر لینی چاہئے ان میں سے ایک (DIOMEDES) حسب معمول شہر جاتا ہے اور شہر کے پھاٹک پر صلیب کا نشان دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر ایک راہ گیر سے پوچھتا ہے کہ یہ واقعی ڈیسیس ہے؟ اپنے ساتھیوں کو اس انقلاب عظیم کی خبر دینے کے لئے وہ بیتاب ہو جاتا ہے، لیکن جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے کھانا خریدتا ہے اور اس کے بدلے وہ سکے پیش کرتا ہے، ہوا اس کے پاس تھیں یہ وہ سکے تھے، جو ڈیسیس کے عہد میں رائج تھا، دکاندار سمجھتا ہے کہ صاحبزادہ کو شاید کوئی خزانہ مل گیا ہے، وہ اور بازار کے اور لوگ اس میں اپنا

حصہ لگانا چاہتے ہیں اور نوجوان کو ڈراتے دھمکتے ہیں اور وسط شہر میں کھینچے ہوئے لے چلتے ہیں ایک مجمع اس کے چاروں طرف لگ جاتا ہے نوجوان چاروں طرف دیکھتا ہے کہ شاید کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر پڑ جائے لیکن کوئی جاننے والا اس کو نظر نہیں آتا، حاکم اسقف اس سے حال پوچھتا ہے، تو وہ سارا ماجرا بیان کر دیتا ہے اور ان کو اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ اس پہاڑ تک چلیں اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کریں یہ لوگ اس کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر جاتے ہیں وہاں ان کو سیسے کی تختیاں ملتی ہیں جن سے نوجوان کے بیان کردہ واقعہ کی تصدیق ہو جاتی ہے، وہ غائب داخل ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھی بھی زندہ ہیں اور نور اور سیگنٹ ان کے چہروں سے ظاہر ہے، یہ خبر بادشاہ (THEODOSIUS) تک پہنچتی ہے وہ بھی غار کی زیارت کے لئے آتا ہے اس موقع پر (MAXIMILIAN) یا (ACHILLIDES) یا کوئی اور نوجوان کہتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان پر یہ نیند اس لئے مسلط کر دی اور قیامت سے پہلے ان کو بیدار اس لئے کر دیا تاکہ حشر و نشر کا ثبوت مل جائے اس کے بعد یہ نوجوان اپنی طبعی موت مرے اور ایک رومی معبد ان کی یادگار کے طور پر وہاں قائم کر دیا گیا۔

جہاں تک اس قصہ کی تاریخی اہمیت کا تعلق ہے بڑے بڑے مورخ اور قصے کہانیاں اور تاریخی داستانوں اور روایتوں کے ناقد بھی اس کی صحت کے قائل ہیں اور اس کو بعید از امکان

ARTICLE "SEVEN SLEEPERS" ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS

اس قصہ کو ابن جریر طبری اور دوسرے مفسرین اور علماء اسلام نے تفصیل کے ساتھ محمد بن اسحاق کی روایت سے درج کیا ہے لیکن مسیحی آخذ کی عدم موجودگی یا عدم اشاعت اور قبل نصرانیت کی رومی تاریخ سے مکمل انقصیت نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بہت سے اوہام راہ پا گئے ہیں (نوٹوں کے لئے دیکھیے تفسیر ابن کثیر ج ۱۵ ص ۱۲۳) اس لئے ہم نے یہاں اس کے بجائے اصل مسیحی آخذ کو ترجیح دی ہے۔

نہیں سمجھتے، اور اس کی وجہ وہ شہرت اور تواثر اور نسل در نسل اس کی منتقلی اور ان تمام قدیم کتابوں میں اس کا ذکر ہے، جن سے مسیحی دنیا بھری ہوئی ہے، لیکن جس کا رجحان ہمیشہ اقسام کے حیر العقول واقعات اور قصے کہانیوں کی تردید و انکار کی طرف رہتا ہے اس واقعہ کے متعلق لکھنا چاہیے:

”اس عجیب غریب قصہ کو محض یونانی روایات و خرافات اور ان کے مذہبی منالطوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس (مفروضہ) ہجرہ کے پچاس سال تک اس کی مستند و قابل اعتماد روایات کا پورا تسلسل قائم رہا، ایک شامی پادری نے جو

تھیوڈیس اصفہ کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا اور جس کا نام JAMES OF SARUG تھا، اس کی ایک کہانی کو (جو دو سو تیس کہانیوں میں ایک تھی) فیسس کے ان نوچواں (اصحاب کہف) کی مدح کے لئے مخصوص کر دیا تھا، اور قبل اس کے کہ چھٹی صدی

مسیحی کا اختتام ہو، اصحاب کہف کا قصہ شامی زبان سے لاطینی میں GREGORY OF TOURS کی نگرانی میں منتقل کر دیا گیا، مسیحی مشرق میں عشاء ربانی کے اجتماعات کے موقع پر اصحاب کہف کی یاد بڑے احترام و عظمت کے ساتھ منائی جاتی رہی، ان کے نام رومی تہواروں اور روسی تقویم میں غایت درجہ احترام کے ساتھ

مندرج تھے، اور ان کی شہرت صرف عیسائی دنیا تک محدود نہ تھی؛

جہاں تک ان سالوں کا تعلق ہے، جو انھوں نے اس غار میں گزاریے ان کی تعداد تین سو سال (جیسا کہ مفسرین اسلام نے مسیحیوں سے نقل کیا ہے) اور تین سو سات سال کے درمیان ہے، مورخ الذکر قول (انسائیکلو پیڈیا ذہاب و اخلاق) کے مقالہ نگار کا ہے تین سو سال اور تین سو نو سال (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے) کے درمیان اس فرق کو متقدمین مفسرین اسلام

لے دیکھیے کتاب ”زوال روم“ مولفہ لیکن جلد دوم (سات سو نوے والے) ۲۲۲-۲۲۳

MODERN LIBRARY GIANT SERIES (U.S.A.)

نے شمسی و قمری تقویم کے اختلاف پر محمول کیا ہے۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ ”یہ اللہ تعالیٰ کی خبر ہے جو اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اصحاب کہف کے غار میں مدت قیام کی بابت دی ہے“ جب سے ان پر نیند مسلط کی گئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیدار کیا، اور اہل زمانہ کو ان کے حال سے آگاہ کیا، اس کی مقدار تین سو سال تھی، جو قمری حساب سے نو سال زیادہ ٹھہرتی ہے، اور سی حساب سے تین سو سال ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر سو سال میں قمری و شمسی تقویم میں تین برس کا فرق واقع ہو جاتا ہے، اسی لئے ”ثلاث مائۃ“ کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ”وازدادوا تسعاً“ (اور زیادہ کئے اس میں نو)

انسائیکلو پیڈیا کا جو اقتباس اوپر گزرا ہے، اس میں اوگرن کی کتاب میں نیز تفسیر نایم کی اکثر کتابوں میں عام طور پر یہی بات لکھی گئی ہے کہ اصحاب کہف کا غار میں پناہ لینے کا واقعہ رومی بادشاہ دسیس کے عہد میں پیش آیا، جس کو عرب مورخین اور علماء اسلام عام طور پر دقیاوس کہتے ہیں، یہ بادشاہ اپنی سخت گیری اور اپنے تعصب مظالم میں بہت مشہور تھا، دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اصحاب کہف کے ظہور کا واقعہ صاحب ایمان عیسائی بادشاہ تھیودوسیوس دوم کے زمانہ میں پیش آیا، یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں بادشاہوں کا درمیانی وقفہ زیادہ سے زیادہ دو سو سال ہے، اسی بنیاد پر گرن نے اس مدت کا مذاق اڑایا ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، بعض قدیم و جدید مفسرین نے اس اشکال سے بچنے کے لئے یہ رائے ظاہر کی کہ قرآن میں جو یہ آیا ہے (وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا) وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں ہے، بلکہ یہ بات اہل کتاب کی طرف منسوب کر کے کہی گئی ہے، اور اس کا تعلق صرف ان کے قیاسات و اندازوں سے ہے، اور یہ بات علیحدہ اور مستقل بالذات نہیں بلکہ اس کا جوڑان

اے تفسیر ابن کثیر (سورہ کہف) ۲۷ مثلاً علامہ جمال الدین قاسمی مولف تفسیر قاسمی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔



ما سبق آیات سے ہے، جن میں یہ کہا گیا "سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَاثِمٌ" (کہیں گے یعنی اہل کتاب تین ہیں، چوتھا ان کا کتا ہے) اس قول کو قتادہ اور طرطوب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے اور اس میں یہ قرأت شاذہ بھی مروی ہے، "وَلَيْسَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ ثَلَاثٌ مِائَةٌ سِتِينَ وَارْدًا وَاسْتَعْمَا" اس قول کو ترجیح دینے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے، جو اس کے معاً بعد آیا ہے یعنی قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسَ لَهُ غَيْبٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ" وہ کہتے ہیں کہ اگر مدت کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، تو آگے کی آیت میں اس کو علم الہی کے حوالہ کرنے کی ضرورت نہ تھی، یہی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے، لیکن علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ بات جبر رضی اللہ عنہ سے اس لئے درست نہیں کہ اصحاب کہف کی تعداد انھوں نے سات ہی لکھی ہے، حالانکہ اس کے بعد بھی یہ آیت ہے کہ "قُلِ رَّبِّي أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ" (کہو اللہ تعالیٰ ان کی تعداد کو زیادہ بہتر جانتا ہے) اس لئے کہ "قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسَ لَهُ" اور اس آخر الذکر آیت میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اور دونوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے پس وہ اس موقع پر اس کا حوالہ کیوں کر دے سکتے ہیں، جب کہ پہلے مسئلہ میں انھوں نے خود اس کو اختیار نہیں کیا۔

بعض اور متنازع علماء نے بھی اس نظریہ کی تردید کی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ عربی زبان کا ذوق سلیم اس سے انکار کرتا ہے اور اگر آدمی کو پہلے سے اس تاویل یا اس تفصیل کا علم نہ ہو تو اس کا ذہن خود سے اس بات کی طرف منتقل نہیں ہوتا، امام رازی لکھتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ کا یہ قول "سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَاثِمٌ" پہلے گزرا ہے اس کے

اور اس آیت کے درمیان جو آیت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے

لے جبرۃ الامر ہے، جو حضرت ابن عباسؓ کا لقب تھا ۵۷ سورہ کہف ۲۲ روح المعانی (تفسیر سورہ کہف)

سے کوئی تعلق نہیں "فَلَا تَسْأَلُوهُمْ الْأَمْرَ أَفْظَاهِرًا" (پس نہ جھگڑا کرو اس میں مگر ظاہری طور پر) اس آیت "قُلْ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسَ لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ" سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے کوئی حکایت ہو اس لئے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد صرف یہ ہے کہ اہل کتاب جو یہ کہتے ہیں اس کو چھوڑ کر اللہ کی دی ہوئی خبر پر اعتماد کرو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ "اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسَ لَهُ" کی بنیاد پر بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اہل کتاب کا قول ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں اللہ تعالیٰ نے یہ بات اہل کتاب کی طرف منسوب نہیں کی، بلکہ یہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔

ہمیں اپنے ذہن میں یہ بات پھر تازہ کر لینی چاہئے کہ اس اشکال اور فرض کردہ تضاد و اختلاف (جو ہمیں قرآن مجید کی بیان کردہ مدت اور گبن کی اس تعداد کے درمیان نظر آتا ہے) جو رومی تاریخ کے جائزہ کی روشنی میں لکھی گئی ہے) کی بنیاد یہ شہرت ہے کہ ان نوجوانوں کی یہ روپوشی اور غار میں پناہ لینے کا واقعہ "دیسس" کے عہد میں پیش آیا جس کی مدت حکمرانی ستمبر ۲۳۹ء سے لے کر جون ۲۵۱ء تک ہے، شاید جس چیز نے اس کو اس قصہ کا ہیرو بنا دیا وہ اس کی قساوت و فحش ریزی، عیسائیوں پر عمومی مظالم اور سرکاری حکام کے سامنے بتوں کے لئے قربانی اور ذبیحوں پر اصرار اور ان سے سزا و اعتراض لینے کا حکم ہے، لیکن جو چیز اس واقعہ میں

لے تفسیر (سورہ کہف) جلد دوم ۵۲ ابواب الصبح لمن بدل دین المسيح ۳۵ دیکھے انسانیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ دیسیس (DECIUS) جلد ۱۵۷، ایڈیشن ۱۹۶۵ء رومن تاریخ سے ہر واقعہ شخص سے یہ جانتا ہے کہ اس فرمان او سزا و اعتراض کا موجب یا محرک دیسیس نہیں بلکہ اس سے بہت عرصہ پہلے "تراجان" نے اس کا اجرا کیا تھا، اور اسی کے عہد میں بیت المقدس اور صلیب کے بڑے پادریوں کو عیسائیت کے جرم میں سزائے موت دیدی گئی تھی دیکھئے۔

شہر پیدا کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اس بادشاہ کی حکومت کا زمانہ بہت مختصر تھا، اس کو دو سال بھی آزادانہ حکمرانی کا موقع نہ مل سکا اور یہ مدت بھی زیادہ تر قوم گوٹھ (GOTHS) کے ساتھ سل جنگوں میں گزری اور وہ فرانس میں دریائے رائن (RHINE) کے کنارے انھیں کے ہاتھوں مقتول ہوا، اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس کو اس قلیل مدت میں اس عظیم و وسیع سلطنت کے تابع دوسرے مشرقی یونانی شہروں کا دورہ کا موقع ملا ہو، تاہم یونان اور مشرقی سلطنت میں اس کے سفر کا سراغ بہر حال نہیں ملتا، "THE HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD" میں ہے کہ ڈیسیس کا عہد بہت مختصر اور پرسکون تھا، زمام حکومت سنبھالتے ہی اس کو ایک بغاوت کی سرکوبی کے لئے "گال" کی طرف رخ کرنا پڑا، اس کا کل زمانہ حکمرانی گوٹھ (GOTHS) کے ساتھ جنگ میں گزرا۔

مورخین نے ان عیسائی رہنماؤں کے نام بھی درج کئے ہیں جن کو بادشاہ نے فرمان شاہی سے سزائی کے جرم میں سزائیں دیں، اس میں اصحاب کثرت کا کہیں ذکر نہیں ہے، ان سزایافتہ عیسائیوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہ تھی، خود "گین" نے لکھا ہے کہ "سزایانے والے مظلوموں کی تعداد دس مردوں اور سات عورتوں سے زیادہ نہ تھی۔"

دوسری بات یہ ہے کہ چند عیسائیوں کی روپوشی ایک مقامی قہم کا واقعہ تھا، اور اس وقت اس کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی کہ مورخ اس کی طرف توجہ کرنے اور مصنف اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کرتے اس کے برخلاف اس طویل اور خارق عادت نیند کے بعد ان کی بیداری، پھر ان شہر میں آمد، مذہبی حلقوں میں اس کی صدائے بازگشت اور آفاق عالم میں اس کی شہرت ایک بالکل غیر معمولی اور عجیب و غریب واقعہ تھا، چنانچہ یہ دوسرا واقعہ یعنی ان کی بیداری اور خود ڈیسیس کے

لہ (ایضاً 413) (VOL. VI - PAGE 413) ۲۷ تاریخ زوال روم موافق گین جلد دوم ص ۹۷

زمانہ میں عیسائی دنیا میں اس خبر کی شہرت و تواتر اس قسم کے واقعات میں سے تھا جو ہر شخص کی زبان پر ہوتے ہیں اور کوئی مجلس و محفل ان کے تذکرہ سے خالی نہیں ہوتی اور جن کی گونج دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچتی ہے، مولخ بھی اس کو قلعینہ کرنے کے شائق نظر آتے ہیں اور راوی و ناقل بھی اس کی نقل و حکایت میں ایک دوسرے سے سہقت لے جانا چاہتے ہیں اس بنیاد پر یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان ظلم و زبردستی اور اس کے بعد ان کی روپوشی کا واقعہ شاہ ہیدرین (HADRIAN P. AELIUS HADRIANUS) کے زمانہ میں پیش آیا ہو، جس نے ایک

لے ہیدرین نے ۱۱۷ء سے ۱۳۸ء تک حکومت کی وہ "تراجان" کے بعد تخت حکومت پر بیٹھا اور کونسل نے اگست ۱۱۷ء میں اس کی توثیق کی اس کی بہت کوشش کی کہ یونانی شہروں کی وہ پرانی روئی اور آگ تاب پھر واپس آجائے اس نے رومی سرحد کی حفاظت کے لئے ایک شہر بنا بھی قائم کیا ۱۳۲ء میں یہودیوں کی بغاوت ہوئی اس کی سرکوبی بھی اسی بادشاہ نے کی اور اس پر قابو پانے کے لئے بہت بے رحمی اور سنگدلی سے کام لیا گیا اس نے سب یہودیوں کو جلاوطن کرنے کا حکم دیا اور بیت المقدس کی زیارت کے لئے سال میں صرف ایک مرتبہ آنکی اجازت دی گئی اس کے بعد یہودیوں کی جلاوطنی اور اخراج کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ قائم ہو گیا (THE HISTORIANS' HISTORY

OF THE WORLD) اس نے ۱۲۹ء میں ایشیائے کوچک اور شام کا سرکاری دورہ کیا اور عمر نامیں ایک دربار کیا جس میں مشرقی ممالک کے تمام سلاطین امر کو مدعو کیا گیا، سردی کا زمانہ اس نے صلب میں گزارا اور ۱۳۰ء میں جنوب کی طرف رخ کیا "قدس" کے کھنڈر پر نیا شہر بنانے کا حکم دیا اور عرب ممالک سے ہوتے ہوئے مصر پہنچا ۱۳۳ء میں فلسطین واپسی پر مجبور ہوا، جہاں اس کو یہودیوں کی ایک بغاوت کو ختم کرنا تھا، اس کے بعد مل قیادت اس نے شہر قائم پولیس سوریس (JULIUS SEVERUS) کے جو کہ کیا اور روم واپس آیا مقام (BAIAE) میں ۱۰ جون ۱۳۸ء میں اس کا انتقال ہوا، ہیدرین کی زندگی متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۱)

عیسائی کلیسیائی تاریخ میں جس کا مصنف (GEORGE H. XYDER) ہے اس کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں:۔  
(باقی صفحہ ۳۷ پر)

طویل عرصہ تک حکمرانی کی اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرقی ریاستوں کا بہت دن تک (جس کی مدت ۱۲۹ء سے لے کر ۳۲۲ء تک پھیلی ہوئی ہے) دورہ کرتا رہا، یہ بالکل ضروری نہیں کہ ظلم اور مذہبی تشدد براہ راست اسی کے ذریعہ یا اسی کے مشورہ سے ہوا ہو، اسی طرح بھی ضروری نہیں کہ اس میں اس کے علم و رضامندی کو بھی دخل ہو، رومی سلطنت اس کے عہد میں بہت وسیع ہو چکی تھی، اور حکام اور اہل کاران حکومت بڑی تعداد میں مختلف ریاستوں اور شہروں میں موجود تھے، چنانچہ اس بات کا پورا احتمال ہے کہ ان میں سے کوئی حاکم اور اپنے علاقہ کا ذمہ ارنڈ ہی بنیا پر ظلم و تشدد پر اتر آیا ہو اور اس نے اپنے ذاتی جذبہ اور مذہبی جوش سے یا حکومت کی عام سیاسی پالیسی پر عمل درآمد کی خاطر اس نئے مذہب کے خلاف سخت گیر طریقہ اپنایا ہو، یہ بات کوئی مفروضہ نہیں بلکہ ہر حکومت اور ہر عہد میں پیش آتی رہی ہے، اس لئے اگر ہم تسلیم کر لیں کہ ان کی روپوشی کا واقعہ بادشاہ ہیڈرین کے اسی دورہ میں پیش آیا، اور ان کی بیداری اور ظہور کا واقعہ تھیوڈوسیوس کے عہد میں ہوا تو قرآن کے بیان اور عیساؤں کی بیان کردہ مدت میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا، اور وہ بنیادی ہیتم جو جاتی ہے جس کی وجہ سے گنن کو استہزاء کا موقع ملا تھا، ایسا کرنا اس لئے بھی ممکن اور قابل قبول ہے کہ اس قصہ کے آغاز اور انجام دونوں کا زمانی تعین اور تہقیق پوری طرح واضح نہیں، خود شامی اور یونانی مورخین کے اقوال میں (جو ان کی بیداری کے سال کے بارے میں ہیں) بڑا اضطراب پایا جاتا ہے، شامی مورخین کا (باقی ص ۳۸ کا) ہیڈرین اگرچہ قدیم رومیوں سے مختلف تھا تاہم وہ بڑا ترقی پسند اور مذہبی معاملات میں بہت خوردہ گیر تھا، اور ان کو شہر کی نگاہ سے دیکھا تھا، اگرچہ اس نے زندگی کا الزام لگائے اور اجتماعی بہتان تراشی سے بچنے کا اشارہ دیا تھا، لیکن وہ زندیقوں اور ملحدوں کو (جو زیادہ تر عیسائی ہوتے تھے) تہوں اور مبودوں کے سامنے قربانی پیش کرنے اور شرکانہ رومی مذہب سے وابستگی پر مجبور کرنے میں اپنے پیشرو تراجن ہی کی پالیسی پر کاربند رہا۔ (ص ۶۶)

دعویٰ ہے کہ یہ ۶۲۵ء یا ۶۳۴ء کی بات ہے، یونانی روایات کا کہنا یہ ہے کہ ان کا خروج تھیوڈوسیوس ثانی کی حکومت کے ۳۸ ویں سال پیش آیا اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ۶۴۶ء کا واقعہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید جو آسمانی کتابوں کا محافظ و نگران بھی ہے ان بضرط اور مختلف روایات اور تاریخی کہانیوں سے زیادہ قابل اعتماد ہے، جو کمی و بیشی، حذف و تخریج اور ترمیم و اضافہ کا ہمیشہ سے شکار رہیں، عیسائیت کے خلاف تشدد اور نظام کی لہروں (۶۷۰ء) کے زمانہ میں زیادہ کھلے ہوئے اور تند و تیز طریقہ پر سامنے آئی اور اس کی تباہ کاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ رومیوں نے بالآخر اس کو عمومی طریقہ پر ختم کر دینے کی کوشش کی قسطنطین نے چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت قبول کر لی، اس لحاظ سے مسیحیت کی ابتدائی تاریخ اب تک اشتباہ اور بے یقینی کے پردوں میں ہے، غرابت و ضعف روایت کی وجہ سے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اور اس میں تاریخی تدوین و ترتیب کی بھی بڑی کمی ہے، جو اعتماد و یقین کے حصول کے لئے ضروری ہے۔

ایک چھوٹی سی جماعت کا ایک چھوٹے سے شہر میں روپوشی اور پناہ گیری کا واقعہ (جو پورے ملک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے) ان کے اس ظہور یا دریافت کے واقعہ سے بہت مختلف ہے جس میں حیرت و استعجاب اور قدرت کے تمام عناصر جمع ہو گئے تھے اور جو اس بادشاہ کے عہد میں پیش آیا جو خود ان کا ہم مذہب تھا۔

اس واقعہ کی اصل اہمیت اور اثرات کا اندازہ اس ماحول ہی میں ہو سکتا ہے جس میں حشر و نشر اور حیات بعد الموت کا عقیدہ سخت اختلاف اور بحث و مباحثہ کا موضوع تھا اور ایک ایسی روشن دلیل کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، جو اس کے امکان وقوع اور دیکھنے لگنے کی تاریخ ۶۲۵ء یا ۶۳۴ء کی مدت حکومت ۶۴۰ء سے ۶۴۵ء تک ہے۔

کا یقین پیدا کر سکے، اس قصہ کا انجام و اختتام اور اس عہد کا تعین جس میں صاحب کہتے اپنی  
 نیند سے بیدار ہوئے اور ان کا آوازہ سارے ملک میں پھیل گیا، ایسا واقعہ ہے جس میں شک و شبہ اور  
 تذبذب کی کوئی گنجائش نہ ہونی چاہئے، اس لئے کہ انسانی فطرت اہم اور حیرت انگیز واقعات کی  
 طرف ہمیشہ زیادہ متوجہ ہوتی ہے اور وہ اس کے دماغ کے حفاظت خانہ میں بھی طرح محفوظ ہو جاتا  
 ہے، علاوہ بریں مختلف دینی جذباتی اور عقلی محرکات کا بھی یہ تقاضہ تھا کہ اس کو تاریخ میں آثارِ  
 کے ساتھ محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچا دیا جائے، برخلاف قصہ کے آغاز کے جس میں اس وقت  
 کوئی خاص شش نہ تھی اور نہ یہ داعی و محرکات موجود تھے ”واللہ اعلم بحقیقۃ الحال“

## قرآن مجید نے اس قصہ کا انتخاب کیوں کیا؟

مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں اس عجیب و غریب قصہ کے ذکر کا اصل سبب  
 محمد بن اسحاق کی وہ روایت ہے، جس میں علماء یہود کے پاس قریش کے ایک فذ کی آمد کا  
 لہ ابن جریر بیان کرتے ہیں:-

”روایت کی ہم سے ابو کریب کہ روایت کی ہم سے یونس بن بکنہ ان سے روایت کی محمد بن اسحاق نے  
 وہ کہتے ہیں کہ اہل مصر سے ایک شیخ نے جو کچھ اوپر بن چالیس میں آئے تھے، حکمران سے انھوں نے ابن عباس سے روایت  
 مجھے سنائی کہ قریش نے نصر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ میں علماء یہود کے پاس بھیجا اور ان سے  
 کہا کہ وہ ان سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق دریافت کریں، اور ان کے اوصاف و اقوال ان کے سامنے رکھیں،  
 اس لئے کہ یہ لوگ سب سے قدیم اہل کتاب میں سے ہیں، اور انبیاء کا جتنا علم ان کے پاس ہے، ہمارے پاس نہیں ہے،  
 یہ دونوں چلے، جب مدینہ پہنچے تو ان علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا، آپ کے بعض  
 اوصاف و اقوال سے ان کو آگاہ کیا اور یہ کہہ کر آپ کو تویریت کے عالم میں، ہم آپ کے پاس اس غرض آئے ہیں کہ  
 (باقی صفحہ ۴۰ پر)

ذکر ہے، جو ان سے کچھ ایسے سوالات معلوم کرنا چاہتا تھا جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

(باقی ص ۳۹ کا) آپ ہمارے ان صاحب کے سلسلے میں کچھ خبر دیں ان یہودی عالموں نے کہا کہ تم ان یہود میں باتیں

پوچھنا جو میں تم کو بتانا ہوں اگر وہ واقعی خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں تو وہ اس کا صحیح صحیح جواب دے دیں گے،

اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو سمجھ لینا کہ کوئی باتیں بنانے والا ہے اس کے بعد جو سمجھ میں آئے کہ نا، ان سے ان نوجوانوں

کے بارہ میں پوچھنا جو قیم زمانہ میں غائب ہو گئے تھے، اس لئے کہ ان کی داستان بہت عجیب غریب ہے، اس

جہاں گرد و تباح شخص کے متعلق پوچھنا جو مشرق و مغرب دونوں جگہ پہنچ گیا تھا، اس کا قصہ کیا ہے،

اور روح کے متعلق پوچھنا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اگر وہ ان باتوں کا جواب بے یاس اور سب اقویہ بیان

کر دیں تو ان کی بات مان لینا، اور اگر نہ بتا پائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یوں ہی یہ سب باتیں گڑھتے

رہتے ہیں یہ دونوں کہ لوٹ کر آئے اور قریش کے پاس پہنچ کر کہا کہ ہم لوگ آپ کے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

کی بابت بہت فیصلہ کن چیز لے کر آئے ہیں، علماء یہود نے ہم کو یہ باتیں بتائی ہیں اس کے بعد انھوں نے ان سب

باتوں کا ذکر کیا، وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے اے محمد میں ان باتوں کی خبر

دیجئے، پھر انھوں نے وہ سب سوالات کئے جو انھوں نے بتائے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کل

ان باتوں کا جواب دے گا، آپ کوئی استثناء اس میں نہیں کیا، وہ لوگ اس پر ہو گئے اس کے بعد ہر روز آپ پر اس طرح گزرتے کہ

نکوئی وحی نازل ہوتی تھی نہ جبریل علیہ السلام آتے تھے یہاں تک کہ اہل مکہ کو نو کہنے سننے کا موقع مل گیا، انھوں نے کہنا شروع

کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کل کا وعدہ کیا تھا، اور آج پندرہ دن ہو چکے ہیں اور ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی نہیں بھیجی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بہت شامی گزری اور ان کی باتوں کی تکلیف پہنچی پھر جبریل علیہ السلام سورہ کہف لے کر

آئے جس میں آپ کے بیچ پر عتاب بھی تھا، اور ان نوجوانوں کا قصہ بھی بیان کیا گیا تھا، اور یہ شخص کا تذکرہ بھی تھا، اور ان کا

یہ قول بھی دیکھو: **وَسُئِلُوا عَنْ الرُّوحِ فَقَالَ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا خَلِيلًا** واضح ہے کہ اس

روایت میں ایک اوی چھوٹا ہے جس محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں اور سن حدیث کے لحاظ سے یہ روایت زیادہ اعتماد

کے قابل نہیں۔



صدائق کا امتحان لیا جاسکے، چنانچہ علماء یہود نے قریش کے وفد کو چند سوالات لکھ کر دیئے جن میں ایک سوال اصحابِ کہف کے سلسلے میں بھی تھا۔

یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تب بھی وہ اس واقعہ کے ذکر کا بنیادی یا واحد سبب قرار نہیں دی جاسکتی جس واقعہ کا انتخاب ان بکثرت واقعات میں سے کیا گیا ہے جن میں مذہبی بنیاد پر اس زیادہ ظلم کی مثالیں ملتی ہیں اور جن کے علم کا ذریعہ وحی آسمانی کے سوا اور کوئی نہ تھا، درحقیقت نزولِ آیات کے واقعات و اسباب (جن میں مفسرین نے بڑی تفصیل کے ساتھ اور دل کھول کر کلام کیا ہے اور جن سے علماء مفقیدین نے ہمیشہ بڑی محسپی) اکثر اتنی اہمیت نہیں رکھتے ہیں، جتنی بہتے علماء نے بیان کی ہے واقعہ یہ ہے کہ اصلاح و تعلیم کے ان بڑے مقاصد میں جن کی تکمیل کے لئے قرآن مجید نازل ہوا، اس فاسد ماحول میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اس فطرت انسانی میں جس میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا، ان زمانوں میں جو پیہم روائے و اہلِ اودۃ اپنا لباس تبدیل کرتے رہتے ہیں اور ان انسانی نسلوں میں جن سے قرآن مجید برابر مخاطب ہے، اور جن کی زمامِ قیادت اور منصبِ امامت نبوت محمدی کے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ طاقتور محرکات و دواعی موجود ہیں، یہ اسباب کسی سوال اور چند لوگوں کے امتحان لینے کی خواہش یا بعض مفسرین کے بیان کردہ شانِ نزول سے زیادہ لائقِ اہتمام اور قابلِ توجہ ہیں جہنرثا ہ ولی اللہ صاحب نے اپنی پیش قیمت کتاب ”الفوز الکبیر“ میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

”عام مفسرین آیاتِ مخاصمت یا آیاتِ احکام میں سے ہر ایک آیت کو کسی نہ کسی واقعہ سے

ضرور وابستہ کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہی واقعہ اور قصہ اس کے نزول کا محرک تھا، حالانکہ

یہ بات ثابت اور طے شدہ ہے کہ نزولِ قرآن کا بنیادی مقصد انسانی نفوس کی تہذیب

و آراستگی، عقائدِ باطلہ کا خاتمہ اور اعمالِ فاسدہ کا انسداد ہے چنانچہ کسی عاقل و باخ

گروہ میں حقائق باطلہ کا وجود بذات خود آیات و احکام کے نزول کا کافی و وافی سبب ہے  
 اسی طرح اعمال فاسدہ اور مظالم کا وجود آیات احکام کے نزول کا محرک اور قرآن مجید  
 میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں، نشانیموں اور عبرت انگیز واقعات کا ذکر آیا ہے اس سے  
 غفلت و بے پرواہی آیات تذکیر کا سبب ہے۔ جزئی واقعات اور بعض متعین قصوں میں  
 جن کے نقل و روایت میں مفسرین نے بڑی دراز نفسی اور دوسری سے کام لیا ہے  
 و حقیقت ان آیات میں اتنا دخل نہیں کہ نہیں سوائے ان بعض آیات کے جن میں خود  
 کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں یا اس  
 سے قبل پیش آیا چنانچہ سامع کا خطبہ ان دور کرنے کے لئے جو اس اشارہ سے پیدا ہوتا ہے  
 اس موقع پر واقعہ کی تفصیل ضروری ہے۔

اصحاب کہف کا یہ قصہ بہت مناسب وقت اور صحیح موقع و محل میں بیان کیا گیا ہے  
 اس لئے کہ مکہ کے مسلمان اس وقت اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے، جن کا سامنا قیصر و  
 کے ظلم و تشدد اور استبداد کے نقطہ عروج میں اصحاب کہف کو کرنا پڑا، یہ وقفہ جس میں وہ زندگی  
 گزار رہے تھے، اس وقفہ سے بہت مشابہ تھا، جس وقفہ میں ترک وطن اور غار میں روپوشی سے  
 پہلے یہ صاحب ایمان نوجوان تھے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی اس بلیغ و معجزانہ تصویر سے بڑھ کر  
 کوئی تصویر نہیں ہو سکتی، جن میں مکہ کے مسلمانوں کا پورا نقشہ بیان کر دیا گیا ہے :-

وَ اذْکُرُوْا اِذَا اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مِّنْ شُعُوْبٍ  
 اور وہ وقت یاد کرو جب (مکین) تمہاری تعداد  
 فِي الْاَرْضِ مِّنْ تَحَاوُفٍ اَنْ يَّخَطَفَکُمْ  
 بہت تھوڑی تھی اور تم ملک میں کم تر سمجھے جاتے تھے  
 النَّاسِ۔ (سورہ انفال - ۲۶)  
 تم اس وقت دوڑتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں چک نہ لے جائیں

لہ الفوز الکبیر۔

حدیث کے مجموعے اور سیرت کی کتابیں ظلم و سنگدلی اور سفاکی و بے رحمی کے ان واقعات سے نہیں بجا اہل ایمان کو پیش آئے تھے حضرت بلالؓ، جہادؓ، خبابؓ، مصعبؓ، سمیہ رضی اللہ عنہم ان کے دوسرے احباب و رفقاء کے واقعات سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں، اور وجدان و طبع سلیم میں ظلم کی نفرت و کراہیت پیدا ہونے لگتی ہے، قرآن مجید اور سیرت نبویؐ میں اس گھٹی گھٹی فضا اور سبھ ہوئے ماحول کی پوری تصویر ہے جس میں مکہ کے مسلمان زندگی گزار رہے تھے، اس بوجھل و کھراؤ و فضا میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی، اور معاشرہ میں کوئی ایسا روزن باقی نہ تھا جس نے دشمن کی کوئی شاع یا تازہ ہو کا کوئی جھوٹکا انداز سکتا، مسلمان دراصل چمکی کے دوپاٹ کے درمیان آگئے تھے، یاد دوسرے الفاظ میں ایک بے رحم و خونخوار زندہ کے پنجوں یا جبرڑوں میں موت و زیست کی لڑائی لڑ رہے تھے، قرآن مجید نے اپنے تبلیغ طریقہ پر اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:-

حَتَّىٰ إِذَا صَافَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ  
بِمَا نَحَبَتْ فَصَافَتْ عَلَيْهِمُ  
أَنْفُسُهُمْ وَظَلَّتْ أَلْأَمْلَاجُ  
مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَیْهِ۔

جبکہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے  
لئے تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان  
سے تنگ آگئے تھے، اور انھوں نے جان  
یا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ

(سورہ برأت - ۱۱۸) نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں۔

عین اس وقت آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، اور قرآن مجید ان اہل ایمان کے لئے ایک ایسا قصہ بیان کرتا ہے جس میں تنگی کے بعد کشائش، سختی کے بعد آسانی، ذلت کے بعد عزت اور سات آسمانوں سے خارق عادت طریقہ پر نصرت الہی کے نزول کا ایسا عجیب و غریب اظہار پیش کیا گیا ہے، جو ہر قیاس اور تجربہ کو جھوٹا ثابت کرتا ہے، اور عقل و دانش کے تمام ظاہری پیماؤں کو چیلنج کرتا ہے، اور یہ بات روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک صاحب ایمان

اقلیت بلکہ مٹھی بھر نوجوانوں کو جو ہر طاقت سے عاری اور ہر ہتھیار سے محروم وہی دست تھے، کفر و فسوق کے ایک جم غفیر اور ظلم و استبداد کے اس انسانی سمندر سے کس طرح نجات عطا فرماتا ہے جس کے ہاتھ میں قوت و اقتدار کی نام تھی، اور جو دولت و طاقت کے تمام وسائل و ذخائر پر پوری طرح قابض تھا، وہ کس طرح زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرتا ہے، ظلمت کے پردوں سے نور ظاہر فرماتا ہے، اور ان قاتلوں کو جن کے منہ کو خون لگ گیا تھا، اور جو دوسروں کا کلیجہ چبانے پر آمادہ اور اپنے خون کی پیاس اور انتقام کی آگ بجھانے پر مصر تھے، نگہبانِ چابان والدین کی طرح شفیق، اور انسانیت کے رحم دل مربی و تالیق بنا دیتا ہے، اور ایمان دار بیٹے کو کافر باپ کا وارث بناتا ہے۔

## مکہ کے اہل ایمان اور اصحابِ کہف میں قدر مشترک

اس سخت و نازک گھڑی میں جب مایوسی و بے دلی پوری فضا پر محیط تھی، کلیجے منہ کو آ رہے تھے، اور آنکھیں پتھرنے لگی تھیں، قرآن مجید نے مکہ کے اہل ایمان کو ایک طرف حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کا نیز حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا وہ قصہ یاد دلایا جو فردا اور جماعت اور ایک نبی اور ان کی قوم کے متعلق ہے، دوسری طرف اصحابِ کہف کا یہ قصہ بیان کیا جس میں ایک ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے ایمان کے امتحان کی داستان بیان کی گئی ہے، یہ قصہ اپنے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے، نیز اپنی شخصیتوں اور کرداروں کے اعتبار سے ضرور مختلف ہیں، لیکن اپنے مقصد میں متحد و متفق اور اپنے اختتام اور نتیجہ میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ اور قریب ہیں، ایک مرکزی نقطہ ان سب میں پایا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا ارادہ قاہرہ، جو ایک مومن کو کافر پر، متقی کو فاجر پر، مظلوم کو ظالم پر، کمزور کو طاقتور پر، اور غریب کے امیر پر

اس طرح غالب اور فقیاب کرتا ہے کہ انسانی عقلیں اس کی توجیہ اور تشریح سے قاصر رہتی ہیں ایک کافر بھی اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوتا ہے اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی سورہ یوسف کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

لَقَدْ كُنَّا فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كُنَّا حَدِيثًا يُنْفَوًى  
وَالَكِنْ نَقْصُيْنَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ  
وَنَقْصِصُ كُلَّ شَيْءٍ وَهَدًى وَرَحْمَةً  
لِّعَوْمِ يُؤْمِنُونَ ۝  
(سورہ یوسف - ۱۱۱)

کرتا ہے اور رہنمائی ہے اور رحمت ہے!

سورہ ہود کے آخر میں آتا ہے:-

وَكُلًّا نَقْصُصُ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ  
مَا نُنَبِّئُ بِهِمْ قَوْلَ آدَمَ وَنُوحٍ وَآلِ  
هٰذَا الْحَقِّ وَمُؤَسَّطَةً وَذِكْرٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝  
(سورہ ہود - ۱۲۰)

موسطت (کہ نصیحت پر کرنے والے نصیحت  
پر کریں گے) اور یاد دہانی ہوئی مومنوں کے لئے!

جب ہم مکہ کے مسلمانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں اور اصحاب کہف میں بڑی مشابہت

نظر آتی ہے، اصحاب کہف نے اپنے دین و ایمان کو قفن سے بچانے کے لئے شہر چھوڑ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی تھی، وہ ایک طویل عرصہ تک ہاں مقیم رہے، یہاں تک کہ ظالم و جابر حکومت جو اہل ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی تھی ختم ہوئی اور رومہ کے تخت پر بت پرستانہ و ظالمانہ حکومتوں کے طویل سلسلہ کے بعد — ایک ایسا شخص متکبر ہوا جو دین سچی کا حامی اور داعی تھا، اور اس کی طرف اپنے انتساب پر فخر کرتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ہر اس شخص کی پوری قدر دانی اور عزت افزائی کرے جو ان مظالم کا شکار ہوا ہے، اور اس کو عظمت و تقدس کے اس مقام پر پہنچائے جو اس کا حق ہے۔

مکہ کے مسلمان بھی اپنے دین پر اس طرح صبر و استقامت کے ساتھ قائم رہے جیسے کوئی شخص اپنی مٹھی میں انگارے ہوئے ہو، اور کسی تپتے اور دھکتے ہوئے پتھر پر کھڑا ہو، بالآخر نجات کی صورت پر مدغم غیب سے ظاہر ہوئی اور ان کو ہجرت کی اجازت ملی اور وہ بھی اس محفوظ قلعہ اور مضبوط غار میں پناہ گیر ہوئے جس کا نام شرب ہے، البتہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اس سے کچھ زیادہ منظور تھا، جتنا ان صاحب ایمان نوجوانوں کے ساتھ جو دوسری صدی عیسوی میں غار میں پناہ گزین ہوئے تھے، فیصلہ الہی یہ تھا کہ ان کے ذریعہ اس کا دین پورے روئے زمین پر غالب آئے اور بحر و بر کا کوئی حصہ اس کے ابر رحمت سے محروم نہ رہے:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (سورہ صفا ۵)

وہ اللہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین لکھ بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

چنانچہ اس نے بعثت محمدی کو (جس پر نبوت کا سلسلہ تمام ہوا) پوری امت کی بعثت کا ذریعہ بنا دیا:-

کُنْتُمْ قَوْمًا مَّأْرُوفًا ۝ اٰخِرُ حَتِّ لِلنَّاسِ  
 تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ  
 عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ  
 (سورہ آل عمران۔ ۱۱۰)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم تمہارا امتوں  
 میں "بہتر امت" ہو جو لوگوں کی ارشاد و  
 اصلاح کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا  
 حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور  
 اللہ پر (سچا) ایمان رکھنے والے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُبَشِّرًا وَلَمُتَّعْتُوْا  
 معترین<sup>۱</sup>۔  
 تم سہولت پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے  
 تنگی و سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔

اس مومن اقلیت کے لئے یتنگ و محدود غار باکل ناکافی تھا، جس میں وہ زندگی کے  
 دھالے سے کٹ کر اپنی زندگی کے دن پورے کرے جب کہ دعوتِ اسلامی کا پورا انحصار اس پر  
 تھا، انسانیت کا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ تھا، حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان میں یہ امت  
 زمین کا نمک تھی، اس معمولی تخم پران سرسبز و شاداب کھیتوں کا دار و مدار تھا، جس میں انسانیت کی  
 زندگی اور بنی نوع انسان کی بقا و فلاح کا راز پوشیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ اقلیت  
 ضائع نہ ہو، بیداری کے بعد پھر زمین کا آشکار نہ ہو، عورت و گوشہ نشینی کی زندگی نہ گزرائے بلکہ خدا  
 کے دین کی کھل کر دعوت دے، باطل کا علانیہ مقابلہ کرے، انسانیت کو ظلم و استبداد کے شکنجے  
 سے آزاد کرے اور اللہ کا نام اور کلمہ ہر چیز پر غالب اور بلند کرے:-

حَتّٰی لَا تَكُوْنُ فِتْنَةً وَّيَكُوْنُ الدِّیْنُ  
 كَلْمًا لِلّٰهِ۔ (سورہ انفال۔ ۳۹)

یہاں تک کہ ظلم و فساد باقی نہ رہے اور دین کا  
 سارا معاملہ اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔

۱۔ روایت حضرت ابو ہریرہؓ (ترمذی)

اصحابِ کہف کے قاصد جب اپنے غار سے نکل کر شہر گئے تو ان کو ایک نئی دنیا نظر آئی، لوگ بھی مختلف اور ان کی تہذیب و تمدن بھی مختلف اور ان کا مذہب بھی مختلف، انھوں نے دیکھا کہ ان ہی کا دین اس ملک میں حکمران اور غالب ہے اور ان کے عقائد احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اسی طرح جب مہاجرین مدینہ سے مکہ گئے تو مکہ نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اب ہاں اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا، بیت اللہ کی کلید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی، آپ کو اختیار تھا جس کو چاہیں عنایت فرمائیں، قہر میں عزت و شرافت اسلام کے اندر سمٹ کر آگئی تھی، اور شرک و بت پرستی ذلت و تحقیر کے ہم معنی بن گئی تھی، کل کے نکالے ہوئے آج کے حاکم انسانیت کے معلم اور قافلہ انسانی کے رہبر بن رہے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو اصحابِ کہف کا قصہ مکہ کے اہل ایمان اور نوجوان مہاجرین کی زندگی سے کس قدر مشابہ ہے، جو تھوڑا بہت فرق ہے، وہ اسلام کے مزاج عام اور انسانی ضروریات و تغیرات کا لازمہ اور قدرتی نتیجہ ہے۔

## تایخ اپنے کو بار بار دہراتی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس دین کے لئے ابدیت اور اشاعت عام اور اس امت کے لئے بقا دوام کا فیصلہ فرمایا ہے، اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام مرحلوں سے گزرے جن سے گذشتہ قومیں تایخ کے مختلف زمانوں میں گزری تھیں، اور اس کی دعوت کو ان تمام قدرتی اور طبعی چیزوں کا سامنا کرنا پڑے جو انسانی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں، اس کو کبھی قوت حاصل رہی، کبھی کمزوری، کبھی کثرت، کبھی قلت، کبھی موافقت، کبھی مخالفت، کبھی فتح اور کبھی ہزیمت، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ جماعتیں جو دعوتِ حق کی علمبردار ہیں، اور عقائد صحیحہ پر قائم ہیں، سخت ترین مظالم



کی تشکار ہوتی ہیں ان کو ایذا رسانی اور صلا وطنی کی طرح کی قسموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کبھی غیر مسلم حکومتوں میں ہوتا ہے اور کبھی ان حکومتوں کے زیر سایہ چین کو اسلامی حکومتیں کہا جاتا ہے اور جس کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو کلمہ گو کہلاتے ہیں، جو بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرتے ہیں، میلاد اور شبِ معراج کے شاندار جلسے کرتے ہیں، بہت شان و شوکت کے ساتھ عید مناتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اسلام کی دعوت اور عقائدِ صحیحہ کو اپنے وجود و سالمیت اور اپنے استحکام و بقا کے لئے اکثر جاہلی تحریکوں، مشرکانہ خرافات اور ملحدانہ خیالات سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں اس وقت اصحابِ کہف کا قصہ سرزمینِ اسلام میں پھر دہرایا جاتا ہے مگر دور و صاحبِ ایمان اقلیت اور منافق و طاقتور اکثریت کے درمیان کشمکش پھر برپا ہوتی ہے اور مسلم نوجوان اصحابِ کہف کے قصہ سے دوبارہ روشنی بصیرت اور نشاط حاصل کرتے ہیں:-

اِنَّهُمْ فِيْهِۦ اٰمَنُوْا بِرَبِّہُمْ وَرَزَقْنٰہُمْ  
 ۞ وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِہِمْ  
 اِذْ قَامُوْا فَاَمَّا وَاٰرِبْنَا رَبَّ السَّمٰوٰتِ  
 ذٰلَاکَ مِنْ لَّنْ تَدَّ عُوٰمِیۡنَ دُوْنِہِ  
 اِنَّا لَقَدْ قُلْنَا اِذَا شَطَطْنَا ۝  
 (سورہ کہف ۱۶-۱۷)

وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان  
 لائے تھے، ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ مضبوط  
 کر دیا اور ان کے دلوں کی (صبر و استقامت  
 میں) بندش کر دی وہ جب (راہ حق میں)  
 کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف)  
 کہہ دیا: "ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان  
 و زمین کا پروردگار ہے، ہم اس کے سوا  
 کسی اور وجود کو پکارتے والے نہیں اگر ہم  
 ایسا کریں تو بڑی بڑی جاببات ہوگی۔

کبھی کبھی یہ حالت اتنی سخت اور جان لیوا ہوتی ہے اور زندگی اور ایمان و عقیدہ کو

باہم جمع کرنا اس قدر محال ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس معاشرہ کو خیر باد کہہ دینے اور عزت و تنہائی کی زندگی گزارنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا، یہ وہ حالت ہے جو صیدیوں اور تاریخ کے طویل وقفوں کے بعد پیش آتی ہے، لیکن نبوت محمدی نے جو تمام زمانوں کی نبوت ہے اور قریم کے حالات میں ہماری مکمل رہنمائی کرتی ہے، اس کی نشان دہی بھی کر دی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

يوشك ان يكون خير مال قريب ہے کہ مومن کا بہترین مال بکریاں  
المسلم عَمَرٌ يَتَّبِعْهُ شَعْفٌ رہ جائیں جن کو لے کر اپنے دین کو فتنہ سے  
الجبال، ومواقع القطر يفتن دینہ بچانے کے لئے وہ کسی دامن کوہ میں یا کسی  
من الفتنة لہ زرخیز وادی میں چلا جائے۔

یہ وہ موقع ہے، جہاں سورہ کہف مومن کی مدد کے لئے سامنے آتی ہے، اور وہ راستہ روشن کر دیتی ہے جس پر اس کو جانا چاہئے۔

اب اصحاب کہف کا قصہ قرآن مجید کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے، یہ ایک ایسا دائرہ یافزیم ہے جس میں زندگی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی نظر آئے گی، اور مختلف قسم کی عبرتیں اور نصیحتیں ہمیں حاصل ہوں گی۔

## بت پرستی و بے قیصری کی حکومت میں

رومنہ الکبریٰ کے ایک شہر میں (جس کو آپ فیسس یا افسوس جو چاہیں کہہ سکتے ہیں) عیسائی تاریخ کے آغاز میں مادہ پرستی اور اس کے نتیجے میں علانیہ بت پرستی اور کھلی ہوئی لذت پرستی

لہ روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ (بخاری)

اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بت پرستی اور شہوت پرستی کا ہمیشہ اس طرح ساتھ رہا ہے، جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ ہو، قدیم ہندوستان کے کھنڈراتراریخی مقامات کی کھدائی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور یونان و مصر اور عرب کے عہد جاہلیت میں بھی یہی بات نظر آتی ہے، چنانچہ یہاں بھی یہ قصہ پیش آیا بت پرستی اور شہوت پرستی کا تیز رہ سیلاب اپنے ساتھ تمام روحانی و اخلاقی قدروں کو بہا لے گیا اور اس سلطنت کے مرکز اور قلب میں یکایک ایسی خالص مادہ پرست سوسائٹی وجود میں آگئی جو ظواہر و محسوسات، فنی لذتوں اور عارضی و نقد فائدوں کے سوا کسی اور چیز کی قائل نہ تھی، حکومت قدرتی طور پر معیشت کے تمام وسائل پر قابض تھی، اور خوشحالی و دولت مندی اور عزت و اقتدار کا سرچشمہ اور مرکز بن گئی تھی، اس کے عقیدہ و رجحان کو اختیار کرنا اور اہل حکومت کی نقل ایک ایسا پل تھا، جو بہت آسانی کے ساتھ حکومت و اقتدار اور عزت و جاہ کی منزل تک پہنچا دیتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے ارد گرد موقع پرستوں اور طالع آزمائوں کا ایک جھٹھا لگ گیا تھا، اور انسانوں کی صرف ایک "قطع" یا ایک "ڈیزائن" باقی رہ گیا تھا، یعنی خواہش نفس کے غلام، کرسیوں کے عاشق اور ریاستوں اور جاگیروں پر مرنے والے۔ حکومت بھی اس عقیدہ و رجحان کو اہل ملک پر نافذ کرنے پر مصر تھی، اور اس بے لگام زندگی اور بت پرستانہ نظام کی جو بھی مخالفت کرتا اس کا تعاقب کرتی، کبھی اس کو زندگی کی دولت ہی سے محروم کر دیتی، کبھی شہری حقوق چھیننے پر اکتفا کرتی، پورے ملک میں زندگی کا ایک طرز اور ایک سلوب بن گیا تھا، جو خرافات اور شہوت پسندی سے مرکب تھا، اس میں کسی نئے رنگ کی گنجائش اور عقیدہ و اخلاق میں کسی تنوع کی اجازت نہ تھی، اور ملک کے تمام باشندے (اپنے طبقوں، نسلوں، عمروں اور عقولوں کے اختلاف اور فرق کے باوجود) کسی

مطبوعہ کتاب کی کاپی بن کر رہ گئے تھے جس کے کسی نسخہ میں کوئی کمی بیشی یا فرق نہ تھا۔

## انقلابی مومن

بت پرستی کی اس ظالمانہ حکومت، جیسا سوز معاشرہ دہشت انگیز ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جن کے پاس حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پہنچی، ان کے نرم دل، زندہ ضمیر اور طبع سلیم نے اس آواز پر لبیک کہا اور پھر یہ دعوت ان کے دل و دماغ پر نہ صرف پوری طرح چھا گئی، بلکہ ان کے لئے ایمان و عقیدہ، لذت و قوت اور یقین و امر بیدہی بن گئی جس کے بغیر ان کے لئے زندگی گزارنا مشکل تھا، اور جس کو وہ بڑی سے بڑی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، خواہ اس کے بدلہ میں ان کو اپنی جان ہی سے ہاتھ دھوئے پڑیں۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں کشمکش سب سے پہلے برپا ہوئی، سب سے پہلے کشمکش خود ان کے دلوں میں پیدا ہوئی اس کے بعد اس کے اثرات باہر تک پہنچے (اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کی کشمکش سب سے پہلے آدمی کے اپنے دل میں پیدا ہوتی ہے) انھوں نے حکومت کی بالکل مختلف اور متوازی سمت میں چلنا شروع کیا، حکومت بت پرست تھی، اور اس کے سوا کچھ اور ماننے والے سننے کی روادار نہ تھی، سو سائنسی گندی تھی، اور گندی کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہ تھی، اور اس حکومت اور معاشرہ کی رضامندی کے بغیر زندگی گزارنا آسان کام نہ تھا، اسباب و سببات کا فلسفہ، تہذیب اور معاشرہ کا مطالعہ اور زندگی کے آشکارا حقائق سب ان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ حکومت اور معاشرہ کے سامنے سپردال دیں، اس لئے کہ کھانے کے بغیر بیٹ نہیں بھر سکتا، اور کھانا بغیر روپیہ کے نہیں مل سکتا، اور روپیہ صرف

حکومت وقت کے پاس ہے، عزت و تیکنامی صرف جاہ سے حاصل ہو سکتی ہے اور جاہ بغیر سرکاری نوکری اور افسری کے ہاتھ نہیں آتا اور نوکری صرف حکومت کے اختیار میں ہے، عاقبت سکون اور سلامتی صرف زمانہ سازی اور سوسائٹی کی موافقت و حمایت میں ہے اور یہ موافقت و اتحاد رائج الوقت عقائد اور رجحان عام کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں، یہ وہ مادی منطق اور طرز استدلال ہے، جو انسانی مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے، اور اس طرح کے تمام معاملات میں یہی نفسیات کا فرما نظر آتی ہے۔

لیکن یہ لوگ بظاہر اس کھلی ہوئی اور صاف منطق کی بھی مخالفت کرتے ہیں، جو اس کے داعیوں اور حامیوں کی نگاہ میں دؤد و چار کی طرح یقینی اور آسان ہے، وہ اپنے ایمان اور عقیدہ سے رہنمائی اور مدد حاصل کرتے ہیں، اور اس وقت ان کی دور رس و عمیق نگاہ حاضر و موجود کے پردوں کو چاک کر کے بہت آگے پہنچتی ہے، اور ان کے سامنے وہ نقشہ آتا ہے، جو شہود سے ماوراء ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ ان اسباب و وسائل کے سوا جن پر یہ حکومتیں قابض ہیں، اور جو سوسائٹی کے تصرف میں نظر آتی ہیں، ایک سبب اور ہے، اور وہ ارادۃ الہی ہے جس نے خود ان اسباب کو پیدا کیا ہے، اور تنہا اسی کی مشیت پردہ کے پیچھے سے اس کو چلا رہی ہے، یہ مشیت جس کے ساتھ ہو جاتی ہے اس پر اسباب یا اسباب والے مطلق اثر انداز نہیں ہوتے، اور وہ ان کا کبھی محتاج نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ حالات اور زمانہ کی رفتار اور چال تک کو اس کے تابع اور اس کی ضرورت اور حال کے مطابق بنا دیتا ہے، اس کے سارے کاموں اور معاملات میں غیر معمولی سہولت، کشادگی اور آسائش پیدا کرتا ہے، اور اس کو اپنی خصوصی رحمتوں و نعمتوں سے نوازتا ہے، اس لئے اس کو ظاہری اسباب کے سارے سر سمجھ جانے اور ان غریبوں اور کمزوروں کے در پر جہہ رسائی کرنے اور

ذیل ہونے کی ضرورت نہیں، صرف عقیدہ پر مضبوطی اور ثابت قدمی ضروری ہے۔  
یہ وہ موقع ہے جب ایمان، ادمیت پر اور منطق، ایسانی منطق، بنیانی پر پوری طرح  
غالب آتی ہے اور یہی سارے قصہ کی جان اور اس کی ”شاہ کلید“ ہے۔

اِنَّهُمْ فِتْنَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَذَرَوْهُمْ  
هُدًى ۝ وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ  
اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ  
وَالْاَرْضِ مَنْ لَّنْ ذُنُوْبٌ مِّنْ ذٰلِكَ  
اِنَّهَا لَقَدْ قُلْنَا اِذَا شَطَطًا هُوَلَا  
قَوْمٌ اٰتَيْنَا مِنْ دُوْنِهِمْ  
اِلٰهًا مَّا كُنَّا لَنَكُوْنُ عَلَيْهِمْ مُّشْرِكِيْنَ  
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰظْلَمُوْا مِنْ اٰفْرِیْ عَلٰی  
اِلٰهِهِ كَذٰبًا  
(سورہ کہف ۱۳-۱۴-۱۵)

وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان  
لائے تھے ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ  
مضبوط کر دیا، اور ان کے دلوں کی (ممبر  
استقامت میں) بندش کر دی، وہ جب  
(راہ حق میں) کھڑے ہوئے تو انھوں نے  
(خاصاً) کہہ دیا: ہمارا پروردگار تو وہی  
ہے، جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے  
ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارتے  
وہ نہیں اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی  
بے جا بات ہوگی“

”یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا  
دوسرے معبودوں کو پکارتے بیٹھے ہیں، وہ  
اگر معبود ہیں تو کیوں اس کے لئے روشن  
دیل پیش نہیں کرتے؟ (ان کے پاس تو کوئی  
دیل نہیں) پھر اس بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا  
ہے، جو اللہ پر چھوٹ کہہ کر بتان باندھے۔“

## عقیدہ کے بغیر زندگی یا زندگی کے بغیر عقیدہ

لیکن سوال یہ تھا کہ جب زمین تنگ ہو چکی ہو، حکومت کے اثر سے ساری آبادی ان کے خلاف ہو، اور معیشت کے اسباب اور رزق کے دروازے بھی بند ہوں اس وقت عقیدہ پر آخر کس طرح قائم رہا جائے ان کے سامنے یا تو ایسی زندگی تھی، جو عقیدہ و اخلاق سے عاری تھی، یا ایسا عقیدہ جو زندگی اور حریت سے محروم تھا۔

یہاں ایمان ان کی دست گیری کرتا ہے اور ان کے دل میں یقین پیدا کر دیتا ہے کہ خدا کی زمین بہت وسیع ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نصرت پر ان کو پورا بھروسہ کرنا چاہئے اور اب جبکہ وہ اپنے تمام فوائد و منافع اور سہولتوں اور لذتوں سے دست کش ہو چکے ہیں، اس مقام پر رہنے کے پابند نہیں:۔

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَفَاقَبْتُمْ  
الْأَنفُسَ فَأَدَا إِلَى الْكَفَرِ  
يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُخَيِّجَ  
لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا  
(سورہ کہف - ۱۶)

(پھر وہ آپس میں کہنے لگے کہ جب ہم نے ان لوگوں سے اور ان سے جنھیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کنارہ کشی کر لی تو چاہئے کہ غار میں چل کر پناہ لیں، ہمارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ ہم پر پھیلائے گا، اور ہمارے اس معاملہ کے لئے (سارے) سرِ سامان ہیا کر دیگا۔

## ترکِ وطن کا صحیح طریقہ

یہ ہو سکتا تھا کہ وہ منہ اٹھائے جادھر چاہتے چل دیتے، ہر شخص اپنا راستہ لیتا اور اپنی

دنیا الگ آباد کرتا اور ایک ایک غاریا پہاڑ کی چوٹی لے لے کر بیٹھ جاتا، جس طرح عیسائی اپنی راہبانہ زندگی اور دور انحطاط میں ہمیشہ کرتے آئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ سب ایک ساتھ جماعتی طریقہ پر اس شہر کو خیر باد کہیں، اپنے دین و عقیدہ کو سینہ سے لگائے اور حرز جان بنائے ہوئے، خدا کی رحمت کے طلبکار اور کشائش و کامیابی اور نصیبین کے منتظر اور امیدوار یہ وہ مناسب طریقہ اور صحیح راستہ ہے، جو اہل ایمان کو ہر اس موقع پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جب زمین ان پر تنگ ہو چکی ہو سارے دروائے ان کے لئے بند کر دیئے جائیں، اور ان کی سب سے قیمتی دولت، دین و ایمان کے ضائع ہونے کا پورا اندیشہ اور خطرہ ہو۔

## ایمان و جو انہر دی اور فرار الی اللہ کا انعام

اس کے نتیجے میں کیا ہوتا ہے؟ ایمان و جو انہر دی کی شرط جب وہ پوری کر دیتے ہیں، جو نصرت الہی اور تائید غیبی کے دستور کی دو بنیادی صفتیں ہیں، یعنی ”ادھم فیتہ“ ”امواہر دھم“ (وہ کچھ نوجوان تھے، جو اپنے رب پر ایمان لائے) تو اللہ تعالیٰ ابھی ان کے حق میں اپنے سارے وعدے پورے فرماتا ہے جس کو اس نے ہدایت اور ثابت قدمی میں زیادتی و اضافہ سے تعبیر کیا ہے۔

وَزِدْنَهُمْ هُدًى وَ يَسِّرْ لَهُمُ الْاٰیٰتِیْنَ ۝ وَ يَسِّرْ لَهُمُ الْاٰیٰتِیْنَ ۝

فَلَوْ بِهٖمْ (سورہ کہف- ۱۳- ۱۴) ان کے دلوں کی (صبر و استقامت میں) بڑھش کری۔

ایک مسلمان مہاجر کو جو اپنی سوسائٹی اور ماحول سے بغاوت کرتا اور آمرانہ حکومت اور مادی طاقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، ہدایت و ثابت قدمی کی سب سے زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خائف اور مضطرب دل کو سکون اور قوت عطا فرمائے، ان شریف و باہمت نوجوانوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا، اور



ان کو مزید ہدایت سے نوازا، ان کا دل اونچا رکھا اور بزدلی اور خوف اور حسرت و اضطراب کو شجاعت و سکینت، قوت و اعتماد اور مسرت و انبساط اور تسلیم و رضا کی شان سے بدل دیا، اور یہی راہ خدا کے ہر اس مہاجر کا زاد سفر اور مجاہد فی سبیل اللہ کا ہتھیار ہے، جو بے خدا معاشرہ کا باغی اور اپنے عہد اور زمانہ سے برسرِ پیکار ہے۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ جب وہ اپنا مستقر اور شہر چھوڑ کر اور تمدن کی تمام رنگینوں اور شہر کی دھچکیوں سے منہ موڑ کر اور اسبابِ معیشت سے دست کش ہو کر مکمل کھڑے ہوئے، اپنا وطن عزیز اور اپنا وہ محبوب باعزت گھر انہ بھی ان کو چھوڑنا پڑا جو بڑا شریف و نیک نام اور عالی نسب تھا۔ تو اس کا انعام اور بدلہ ان کو یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے کشادہ اور صحت و طب کے لحاظ سے موزوں ترین غار کی طرف ان کی رہنمائی کی کہ بڑی بڑی تنظیمیں مل کر بھی کوئی ایسی وسیع، لطیف اور صحت مند رہنما گاہ تعمیر نہیں کر سکتیں اس کی شان یہ تھی کہ سورج کی روشنی اور گرمی اس میں ضرور پہنچتی تھی لیکن اس کے مصراثرات (یعنی ضرورت کے برہمی ہوئی حرارت اور پش) سے وہ محفوظ رہتا تھا، دوسری طرف تازہ اور پاکیزہ ہوا ان کو زندگی و نشاط سے الما مال کرتی تھی:-

وَتَنَزَّى السَّمْسُ إِذَا أَطْلَعَتْ تَنَزَّادُ      اور وہ جس غار میں بیٹھے وہ اس طرح واقع  
عَنْ كَفِّهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ      ہوئی ہے کہ جب سورج نکلے تو تم دیکھو کہ ان کے  
وَإِذَا غَرَبَتْ تَقَرَّبُ مِنْهُمْ      واسطے جانب ہٹا ہوا دروازہ ہے اور جب ڈوبے  
ذَاتَ الشَّمَالِ وَهُمْ      تو بائیں طرف کمر اکڑ کر رکھ جاتا ہے (یعنی کسی

لہ علامہ آلوسی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ نوجوان رؤسیوں کے اثرات اور سر پر آوردہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے (روح المعانی ج ۵ ص ۱۱) لہذا ان العرب میں ہے کہ کہتے پہاڑ کے غار کو کہتے میرا فرق یہ ہے کہ اگر زیادہ کشادہ اور بڑا ہوگا تو اس کو کہتے کہا جائے گا، تنگ اور چھوٹا ہوگا تو اس کو المنارہ کہیں گے۔

حال میں بھی اس کی شعا میں اندھیر نہیں بنتیں)

اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہیں پٹے ہیں۔

اس طرح اس متعین اور نجس تہذیب اور اس کے ظالم و بدکردار علمبرداروں اور حامیوں سے ان کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور زندگی کے قدرتی اسباب و وسائل اور پاک و نطیف بیرونی دنیا سے استوار ہو گیا وہ دنیا سے کنارہ کش بھی تھے، لیکن اس کے تمام منافع اور سہولتوں اور آسائشوں سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے، اور صرف ایمان محکم اور جہاد صادق کا ثمرہ اور لطف الہی اور ہدایت ربانی کا اثر ہی۔

ذَٰلِكَ مِنَ الْآيَاتِ الَّتِي لَا يَعْقِلُهَا أَكْثَرُ النَّاسِ ۖ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ

یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ

انھوں نے حق کی خاطر دنیا اور دنیا کے سامنے

علاقے چھوڑ دیئے (جس کی پر وہ کامیابی کی)

(سورۃ کہف - ۱۷)

راہ کھول دے تو وہی راہ پر ہے۔

خدا کی قدرت اور شریعت کے منکروں اور فطرت اور کائنات کے باغیوں اور کشتوں نے ہمیشہ اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اور سارا علم اور ذہانت اس بات پر صرف کی کہ شریعت، خوشگوار اور صاف و شفاف چیز عیادت کا کوئی جرم ان کے نصیب میں آجائے اس کے لئے کائنات کی طاقتوں کی انھوں نے تسخیر کی، راحت و آسائش کے تمام وسائل و ذرائع فراہم کئے لیکن نتیجہ سے ہمیشہ محروم رہے کائنات اور زندگی کے وسائل الٹے ان ہی کے خلاف ہو گئے، اور ان جگہوں کے ان کو ناکامی و ملامت ہو

۱۔ سورۃ کہف - ۱۔ روح المعانی میں ہے کہ ان کو دھوپ سے اسطو ہی نہ چڑتا تھا کہ ان کو کچھ تکلیف ہوتی، وہ غار کے وسط میں تھے تازہ ہوا ان کو حاصل ہوتی تھی، اور غار کی تکلیف و تنگی اور سوچ کی سوزش و ٹپش سے وہ محفوظ تھے (ج ۵ ص ۲) امام رازی نے لکھا ہے کہ غار کا دروازہ شمال کی جانب کھلتا تھا جب سورج طلوع ہوتا تو غار کے داہنی طرف ہوتا جب غروب ہوتا تو شمال کی طرف ہوتا۔ ج ۵ ص ۲۶۶

کاسندھیکھنا پڑا جہاں ان کا وہم و گمان بھی نہ جاتا تھا، اور بالآخر خود اپنے ہی ایجادات و وسائل،  
مہلک بیماریوں، نئے نئے پیچیدہ مسئلوں اور تباہ کن جنگوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَنْ يَهْدِيَهُ  
وَلَيَأْتِيَنَّ شِدَاحَهُ (سورہ کہف - ۱۷)  
اور جس پر گم کر دے راہ تو تم کسی کو اس کا راساز  
اس کا راہ دکھانے والا نہ پاؤ گے!

## ایمانی غار کی زندگی

اس ایمانی غار میں اپنی زندگی انھوں نے تعطل و بے عملی میں نہیں گزار دی وہ وہاں نہ ظلمت  
یا بے بصری میں مبتلا تھے، اور نہ خدا کے قانون و ہدایت نامہ سے محروم تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض  
صحیفے اور لکھے ہوئے اوراق (جو شاید تورات و انجیل سے متعلق ہوں) اور علوم نبوت کے آثار باقیہ  
وہ شہر چھوڑتے وقت اپنے ساتھ لیتے آئے تھے، اور یہ ایک ایسا نمونہ ہے جس پر اپنے ماحول و معاشرہ سے

لے قرآن ان لوگوں کا ذکر اصحابِ اکہف والرقیم کے ساتھ کرتا ہے، رقیم کی تفسیر میں مفسرین کی مختلف رائیں ہیں، بعض  
لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر کی سل ہے، جس پر ان کا قصہ یا ان کے نام لکھے ہوئے ہیں اور جو غار کے دروازہ  
پر ایسا تودہ ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ گاؤں یا شہر کا نام ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے مضمون میں یہ رائے  
ظاہر کی ہے کہ وہ لکھے ہوئے صحیفے یا اوراق ہیں جو غار میں ان کے منس و رفیق تھے ان کے اس خیال کی تائید عبداللہ ابن عباس  
رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہوتی ہے، جو صاحبِ ریح المعانی نے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ دراصل ایک کتاب تھی جو ان کے  
پاس تھی، اس میں ابن عسوی کی تعلیمات درج تھیں (ج ۵ ص ۱۱) اور ہمارے نزدیک زیادہ قابل ترجیح بات یہی ہے،  
ابن جریر نے بھی اپنی سند سے ابن زید سے روایت کی ہے کہ رقیم کتاب کو کہتے ہیں اور اس کتاب کا کوئی خاص راز یا  
معالفہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے، اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی ”وَمَا أَفْهَمُكَ مَا عَشَوْنَا بِكَ لَنَبِّ مُؤْمِنِينَ  
يَشْهَدُونَ الْمَقْرُونِينَ“ (ج ۱۵ ص ۱۲) امام بخاری کہتے ہیں، رقیم کتاب کو کہتے ہیں۔

تمام بغاوت کرنے والے اور تمام مہاجر اور پناہ گیر اس وقت عمل کر سکتے ہیں جب عزت و ہجرت کا موقع ہو اور اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے۔

جب زادراہ اور ذخیرہ جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ٹٹھی گہری اور طویل نیند کی آغوش میں پہنچا دیا، اور کھانے پینے کی احتیاج بھی باقی نہ رہی:-

فَصَرَبْنَا عَلَىٰ اِذَا نَفَخَ فِي الْكُفْمِ سِتْرٌ  
عَدَدًا (سورہ کف - ۱۱)

تو ہم نے انھیں اسی غار میں تھپک کر چند سال کے لئے گہری نیند سلا دیا۔

## روم میں حالات کی تبدیلی

اب صحابہ کھف کے معجزانہ واقعات میں سے سب سے بڑا معجزہ ظاہر ہوتا ہے، ان کی نیند اور گوشہ نشینی کے دوران ان کے شہر پوری مملکت اور اس کے ماتحت علاقوں میں حالات کبیر تبدیل ہو جاتے ہیں، بت پرستی اور شہوت پرستی کی بساط الٹ جاتی ہے، اور زمانہ کا حافظہ اس کے بڑے بڑے علمبرداروں کے نام تک فراموش کر دیتا ہے، اور اس بت فروش اور جیسا سوز معاشروں کے ملبرہ پر ایک ایسی حکومت اور معاشروں وجود میں آتا ہے، جو اللہ تعالیٰ پر اور مسیح علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، اور اس نئے مذہب کا پرچوش وکیل اور داعی تھا، جس سے گذشتہ حکومتیں طویل عرصہ تک

لے قیطنین الکبر کے عہد کا واقعہ ہے جس نے ۳۳ھ میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی، اور عام روایت کے مطابق عیسائیت قبول کر لی تھی (بہت مورخ اس کے اخلاص اور درستی نیت میں شک کرتے ہیں ان کے نزدیک اس نئے مذہب کو اختیار کرنا سیاسی مصالح کے لئے تھا)، اور ملک کا سرکاری مذہب بھی عیسائیت کو قرار دیا تھا، اس نئے عقیدہ عیسائیت میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرنے اور مذہبی اختلافات اور فرقہ بندیوں کو ختم کرنے کے لئے پادریوں کی اہم محفلیں منعقد کی تھیں، یہی حکمران جس نے قسطنطنیہ کا شہر آباد کیا جو اس کے نام سے موسوم ہے، اوچو اس کی حکومت کا پایہ تخت تھا، اس کا انتقال ۳۳ھ میں ہوا۔

برسرِ جنگ رہیں، اور اس کے نمائندوں اور پیروؤں کو جلاوطن کرتی رہیں، اور طرح طرح سے ستاتی رہیں، اب اس کے بجائے اس مذہب کی طرف انتساب کرنے والوں کی توقیر کی جاتی تھی، اور نہایت گرم پوشی سے ان کا استقبال ہوتا تھا یہ وہ موقع ہے، جب اصحاب کہف اپنی طویل نیند سے بیدار ہوتے ہیں جو تین سو برس سے زیادہ سے ان پر طاری تھی :-

وَلَيْسَ إِلَٰهِي كَمَا تَقُولُونَ ثَلَاثَ مِائَةٍ سَنَةٍ  
وَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى (سورہ کہف - ۲۵)

اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو برس تک رہے اور نو برس اور پورا رہے۔

وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ہم لوگ کتنی دیر سے سوئے تھے، اس طویل وقفہ کے اندازہ اور تعین میں وہ مختلف رائے ظاہر کرتے ہیں، پھر معاملہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے کہ ان باتوں پر نہ دین کا انحصار ہے نہ دنیا کا :-

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ هَٰذَا قَالُوا لَبِثْنَا  
يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ هَٰذَا قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ  
بِمَا لَبِثْتُمْ

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا ہم یہاں کتنی دیر تک رہے ہوں گے؟ تم نے کہا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، پھر جب ٹھیک ٹھیک نہ

معلوم نہ کر سکے تو بولے ہمارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کتنی دیر تک پڑے رہے ہیں۔

(سورہ کہف - ۱۹)

تھوڑی دیر کے بعد ان کو بھوک لگتی ہے، اپنے ایک ساتھی کو وہ اس پر متعین کرتے ہیں کہ وہ کہیں سے اچھے اور پاکیزہ کھانے کا بندوبست کرے، جو چاندی کے سکے وہ اپنے ساتھ لیتے آئے تھے، وہ اس کے حوالہ کر کے شہر روانہ کرتے ہیں :-

لہذا لازمی ہے کہ ان کی تعمیر میں کھلم کھلا ہے کہ زیادہ پاکیزہ اور مزے دار اور یہ کھانے کے اس آیت سے ہمیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ زوارہ اور خدا کا انتظام شریعت الہی میں ثابت و مسلم ہے اور اس سے کوئی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

فَإِنتَبِهْ لِمَا كُنْتُمْ تُؤْمِرُونَ وَلِمَا كُنْتُمْ يَأْمُرُونَ  
الْمُؤْمِنِينَ فَلْيَنْظُرُوا إِلَيْهَا أَنْتُمْ لَهَا شَهِيدُونَ  
فَلْيَاذْكُرْهُمْ رَبِّي يَتَوَفَّوهُ (سورہ کہف - ۱۹)

اچھا ایک آدمی کو یہ کہنے کے شر میں بھیج جا کر  
دیکھئے کس کے یہاں اچھا کھا نا ملتا ہے وہاں  
ان کی دانست میں حکومت ابھی تک دشمنوں کے ہاتھ میں تھی اور جاسوس سپاہی ہر طرف  
ان کے تعاقب میں پھیلے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے جاتے وقت اپنے ساتھی کو احتیاط اور نرمی  
سے کام لینے کی خاص طور پر ہدایت کی:-

وَلْيَسْلُطْ وَلَا يَتَّخِذُوا بِكُمْ أَمَدًا  
أَنْتُمْ إِنْ تَنْظُرُوا لَعَلَّكُمْ تَزْجُرُوهُمْ  
أَوْ يُعَيِّنُوا كُمْ فِي مَلْعَنَةٍ وَلَنْ تَنْفَعُوا  
إِذَا أَلْبَسُوا

اور ہاں، چپکے لئے کسی کو ہماری خبر نہ ہونے  
پائے اور اگر لوگوں نے خبر پائی تو وہ چھوڑ دالے  
نہیں یا تو نگہ سار کریں گے یا مجبور کریں گے  
کہ پھر ان کے دین میں واپس چلے جائیں اگر  
(سورہ کہف - ۱۹-۲۰)

ایسا ہوا تو کچھ بھی تم نفع نہ پاسکو گے۔  
دوسری طرف اہل شہر بہت پرستوں کے عہد حکومت میں ان خدا پرست نوجوانوں پر ظلم و زیادتی  
کے قصہ سے اچھی طرح واقف تھے، ان کو اس کا علم تھا کہ ان کے ساتھ کیا اجرا ہوا اور وہ کس طرح  
اچانک و پوش ہو گئے کہ ان کے نام و نشان تک کا پتہ نہ چلا، عیسائی حکومت نئی اور نازہ دم تھی، اور  
عیسائیت کے آثار و نشانات کو پھر سے اجاگر کرنا چاہتی تھی، اور اس کے خاص رہنماؤں، قربانی دینے والوں  
اور شہیدوں کے کارنامے دوبارہ زندہ کرنا چاہتی تھی، اور اس فکر میں تھی کہ ان کی کوئی بڑی یادگار قائم کرنے  
اور ان لوگوں میں صحابہ اکہف والہ قہم قدرتی طور پر اس کی نظر میں سب سے پہلے آتے تھے۔

کل کے جلا وطن آج کے ہیسرو

نتیجہ یہ ہوا کہ اصحاب کہف کا قصہ پورے شہر کا موضوع بن گیا، ان کا فرستادہ چھپتے چھپتے

نظر میں بچاتے، مرموز کر سمجھے دیکھتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوا، وہ جلد سے جلد کوئی لذیذ و پاکیزہ کھانا لے کر لٹے پاؤں واپس آنا چاہتا تھا کہ اچانک وہ پورے شہر کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور وہ اور ان کے سارے ساتھی دیکھتے دیکھتے ہیر و قرار دے دیئے گئے اور کڑی و غیر کڑی دونوں سطحوں پر ان کے جہاد و قربانی اور عزیمت کے نغمے گائے جانے لگے۔

سب سے پہلے ان قدیم سکون نے (یا اس قدیم لہجہ اور مخصوص پوشاک نے) ان کا راز افشاں کیا، لیکن قرآن مجید ان تفصیلات کے زیادہ سرور کا نہیں رکھتا اس لئے کہ اس کا موضوع ہدایت ہے قصہ داستان گئی نہیں پورے شہر بلکہ ملک کے تمام حصوں میں خبر بگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور اس کے سوا کوئی موضوع سخن باقی نہیں رہتا ہر مجلس میں اس کا چرچا اور ہر گھر میں اس کا ذکر ہوتا ہے لوگ پارٹیاں بنانا کہ اس غار کی زیارت کے لئے جہاں انھوں نے پناہ لی تھی جاتے ہیں قرآن مجید اپنے معمول کے مطابق یہاں بھی ان کے استقبال و دو لوگوں کی گرمجوشی اور عزت افزائی کے ذکر سے گریز کرتا ہے لیکن بڑی قوت اور تاکید کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہے کہ:

وَكَذَلِكَ أَغْتَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيُظَاهَرُوا ۖ وَآتَ

وَعَدَ اللَّهُ هَٰؤُلَاءِ أَن السَّاعَةَ لَا يَزِيدُ

فِيهَا ۖ (سورہ کہف - ۲۱)

اور (پھر دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے

لوگوں کو ان کے حال سے واقف کروایا (ان کی بات

پوشیدہ نہ کی) اور اس وقت کہ کیا لوگ جان لیں

اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آئیں کوئی نہیں!

یہ انقلاب جو حکومت اور عوام دونوں میں برپا ہوا اور اتنے طویل عرصہ تک غائب رہنے کے بعد یہ لوگ جس طرح دریافت ہوئے ان سب باتوں میں دراصل اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی تکمیل تھی جو ان کے آثار کو نقش جاوداں بنانے اور ان کے دشمنوں کو ناکام و مغلوب کرنے کے سلسلے میں کیا گیا تھا، اور اس بات کی دلیل کہ گردش میل و نہار و اقبال و ادبار سب اللہ کے ہاتھ میں ہے:-

وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا يُزِيدُ فِيهَا ۖ

بَلَا تَزِيدُ مَرَّةً ۖ (سورہ کہف - ۲۱)

وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ  
شہ نہیں اور اللہ ضرور انہیں اٹھا کر آئے گا

(سورہ حج - ۷) جو قبروں میں پڑ گئے (یعنی مر گئے)۔

کیا اس وقت کوئی توقع کر سکتا تھا کہ ظلم و استبداد کی حکومت ایک ن اس طرح ختم ہوگی بظلم  
عیسائیت کا دوبارہ احیا ہوگا، اصحاب کہف اتنے طویل زمانہ کے بعد اپنے اس غار سے (جس کو ایک مسیح  
مقبور بھی کہہ سکتے ہیں) برآمد ہوں گے اور تقدیس و تعظیم کا ایک ہالہ ان کے گرد قائم ہو جائے گا حکومت  
کی آغوش بھی ان کے لئے وا ہوگی اور شہر والے بھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور دیدہ و دل  
ان کے لئے فرش راہ کریں گے، کیا اس میں قریش کے سرداروں اور مکہ کی سربراہان و رشتہ دہنیوں کے لئے  
کوئی سامان عبرت اور کمزور و متم ریدہ مسلمانوں کے لئے کوئی و تہسلی اور پیغام امید نہیں ہے؟  
یہ نوجوان جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور تھا زندہ رہے پھر ان کا انتقال ہوا اور عقیدہ تہذیب  
اور محبین مخلصین میں ان کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہوا کہ اس کی کیا شکل ہونی  
چاہئے اور کیا چیز اس کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے:-

إِذْ يَبْتَازُ عَوْنٌ بَيْنَهُمْ أَمْرُهُمْ فَقَالُوا  
اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے

ابْنُوا عَلَيْهِمْ بُيُوتًا رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ  
لگے ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے لوگوں نے

قَالَ الَّذِينَ عَلَيْهِمْ آلَاءُ رَبِّهِمْ  
کہا "اس غار پر ایک عمارت بنا دو کہ یادگار رہے

لَتَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَسْجِدًا  
اس سے زیادہ اس معاملہ کے پیچھے نہ پڑو) ان پر

۱۔ سورہ کہف - ۲۱۔ علامہ راوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں "اس آیت سے بعض لوگوں نے بزرگوں کی قبروں پر عمارت تعمیر

کرنے اور اس پر مسجد بنانے کے جواز پر استدلال کیا ہے جو نہایت درجہ لغو و باطل قول ہے بخین اور نسائی نے حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو مرد و عورت

پر انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنالیا " احمد بخین اور نسائی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ لوگ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی

(باقی صفحہ ۶۵)



جو کچھ گزری، ان کا پرہیز اسی بہتر جانتا ہے

تو ان لوگوں کو کہہ کہ جو معاملات پر غالب آگئے تھے

مٹیکے ہم ضرور ان کے مرتد پر عبادت گاہ بنائیں گے

یہ گرجوشتی صرف ان کے زمانہ تک اور صرف ان کی تعمیری یادگار تک محدود نہ رہی بلکہ تاریخ اور مذاہب میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گیا، اس پر مباحثے اور اختلافات ہوئے متعدد گروہ اور فرقے قائم ہو گئے اور مختلف مکاتب خیال وجود میں آئے اور ہمیشہ یہ سب کا محبوب موضوع رہا:-

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّآوَاهُمْ كَذِبُهُمْ ۖ

وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَذِبُهُمْ ۖ

رَجَعُوا إِلَى الْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ ۖ

وَرَأَيْنَاهُمْ كَذِبُهُمْ ۚ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ

بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۚ ذَٰلِكَ

فَلَا تُشَارِقُهُمُ الرَّاغِبَاتُ ظَاهِرًا

وَلَا تَسْتَفْتِي فِيهِمْ صَفْوَةً أَحَدًا ۚ

جس صورت حال یہ ہے (تو لوگوں سے اس

بائے میں بحث و نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک

(سورہ کہف - ۲۲)

(باقی ص ۶۴ کا) بدترین خلقت میں ہوں گے، آیت میں صرف چند لوگوں کی بات نقل کی گئی، جو ایسا کرنے کا ارادہ کر رہے تھے

اس سے ان کی تحسین یا ان کی بیروی و نقل کا پہلو کسی طرح نہیں نکلتا، جب یہ ثابت نہیں کیے کہ اپنے دوائے معصوم تھے

اس وقت تک ان کا علم کمال بھی قابل تقلید نہیں، ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد سلاطین و امراء ہیں، جیسا کہ

حضرت قتادہ سے مروی ہے (روح المعانی ج ۵ ص ۳۱-۳۲)

صاف بات میں ہو، اور نہ ان لوگوں  
میں سے کسی سے اس بابے میں کچھ دریافت کر۔

## مادیت پر ایمان کی فتح

یہاں پرسودہ کہف کے چاقصوں میں سے یہ لازوال قصہ ختم ہوتا ہے جس میں ایمان اور مادیت کی کشمکش بیان کی گئی ہے، اور جس کو دوسرے الفاظ میں باب بعد اعتماد اور خالق اسباب پر اعتماد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یہ قصہ مادیت پر ایمان کی فتح اور خالق اسباب پر اعتماد کا کل اور صدق و یقین پر ختم ہوتا ہے۔

ان ایماندار اور سچے نوجوانوں نے مادیت پر ایمان کو ترجیح دی، فوری نفع اور نقد فائدہ پر آخرت کے وعدہ کو مقدم رکھا، انھوں نے ایمان کے ساتھ غربت و افلاس کی زندگی کو پسند کیا، لیکن کفر کے ساتھ دولت و امارت کی زندگی کو اراذ کی، انھوں نے اس کو ترجیح دی کہ وطن، اہل و عیال اور دوست احباب سے دور رہیں اور زندگی کی ہر لذت اور اقتدار کی ہر عزت سے محروم رہیں، لیکن اس کو ایک لمحہ کے لئے گوارا نہ کیا کہ شرک سے اپنی پیشانی کو داغدار کریں، نفس کے بندے اور خواہشات کے پرستار بنیں، معصیت و سرکشی اور ظلم و زور دہنی کے ساتھ تعاون کریں، انھوں نے نفس کے تقاضے سے زیادہ روح کے تقاضے اور عقل کے مطالبہ سے زیادہ ایمان کے مطالبہ پر توجہ دی اور جسم و جان کے ساتھ اس میں مشغول ہو گئے، اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ وہی زیادہ دور اندیش، دقیقہ رس اور حقیقت شناس تھے، اور یہ کہ انجام کار اہل تقویٰ کے ہاتھ ہے، انھوں نے اسباب سے خالق اسباب کی طرف راہ فرار اختیار کی اور اس راہ کی ہر تکلیف پر اپنے کو آمادہ کر لیا، یہاں تک کہ اسباب ان کے تابع ہو گئے، اور حکومت وقت (جس کے مظالم سے

بچنے کے لئے انھوں نے روپوشی اختیار کی، ابھی ان کی ہمنوا ہو گئی، اصحاب کہف کا قصہ ایمان و جو انفرادی، استقامت و ثابت قدمی اور جہاد و قربانی کا وہ قصہ ہے، جو انسانیت اور حق و عقیدہ کی تائید میں بار بار پیش آتا رہا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسباب ارادۃ الہی کے تابع ہیں، اور وہ ایمان و عمل صالح کی توثیق و تصدیق کرتے ہیں، اس لئے مومن کا راستہ اور طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ اس ارادہ کو اپنی طرف متوجہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا مستحق بنے۔

قبل اس کے کہ قرآن مجید اپنے دوسرے قصہ کا (جو دو باغ رکھنے والے) سے متعلق ہے، آغاز کرے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی وصیت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس سے طاقور سبب اور مضبوط کرے کہ جو انفتالی کے ساتھ پکڑے رہیں، اور یہی ایمان اور قرآن کا راستہ ہے، وہ آپ کو اس کی نصیحت کرتا ہے کہ آپ ان اہل ایمان کی رفاقت کا التزام رکھیں، جو ایمان، معرفت یقین، اور ذکر و دعا کی دولت سے سرفراز و خوش نصیب ہیں، خواہ اسباب مادی اور منلغ دنیا میں ان کا حصہ کم سے کم ہو، ان جاہل و غافل انسانوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے، جو ایمان، معرفت اور یقین اور اس کے اثرات مثلاً ذکر و دعا وغیرہ سے محروم ہیں، اگرچہ اسباب و وسائل اور دنیا کی نعمتوں کی بہت بڑی مقدار اور ذخیرہ ان کے ہاتھ میں ہے۔

در اصل یہ وصیت عام ہے، اور اس کا مخاطب قرآن مجید کا ہر پڑھنے والا اور ماننے والا ہے، بلکہ عام اہل ایمان اس کے سب سے زیادہ محتاج ہیں، اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سب سے پہلے ان کو ضرورت ہے:-

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ  
رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ

اور جو لوگ صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے  
رہتے ہیں، اور اس کی محبت میں سرشار ہیں،

وَجِبَتْ وَلَا تَعْدُ عَيْنَكَ عَنْهُمْ  
تو انہی کی صحبت پر اپنے جی کو قائل کرو اور ان کی  
تَرْبِيَةُ نَبِيَّةٍ الْحَيَوَةِ الدُّنْيَا وَلَا تَطْلُعْ  
طرف سے کبھی تمہاری نگاہ نہ پھیرے کہ ذہنی  
مَنْ أَخْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ  
زندگی کی رونقیں نہ دھونڈنے لگو جس کے دل کے  
هُمُوهٌ وَكَانَ أَمْرُهُ قُرْطَاهُ  
ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا (یعنی ہمارے  
(سورۃ کہف - ۲۸)

دل غافل ہو گیا) اور وہ اپنی خواہش کے  
پیچھے بڑ گیا تو ایسے آدمی کی باتوں پر کان نہ  
دھرو اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔

اصحاب کہف 'اہل ایمان' اور 'اہل معرفت' کا ہر زمانہ میں شیعوہ اور دستور رہا کہ وہ ایمان  
و عمل صالح اور خدا سے روحانی تعلق اور نسبت کو ہمیشہ ادی اسباب اور ظاہری مشکلوں پر ترجیح  
دیتے رہے، مادیت اور اس کے علمبرداروں کے خلاف انھوں نے ہمیشہ علم بناوت بلند رکھا اور  
دنیا اور زینت دنیا کو کبھی نظر بھر کر نہ دیکھا اور یہی سورۃ کہف کا پیغام اور قرآن مجید کی دعوت ہے:-

وَلَا مَمَدًا لِّعَيْنِكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُ  
اور یہ جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو ذہنی زندگی  
كَآرَاتٍ لِّسِيٍّ دَعَى رُكْبَى هِيَ اَوَّلَانِ سَعِ وَهَ قَانَا اَتَا  
کی آرائشیں دے رکھی ہیں اور ان سے وہ قانوا اٹھا  
لِيَنْتَهِي عَنْ فِتْنَةٍ وَارْتَفَعَ رَيْفٌ خَيْرٌ  
یہ ہے میں تو تیری نگاہیں اس پر نہ جھیں (یعنی یہ بت  
تیری نگاہیں نہ جھپے) یہ سب کچھ اس لیے کہ ہم نے  
وَأَبْقَى ه

انھیں آزمائش میں ڈالے اور جو کچھ تیرے پر دکھا  
(سورۃ ظہر - ۱۳۱)

کی بخشی ہوئی روزی ہے وہی (تیرے لئے) بہتر  
ہے اور (باعتبار تیرے لیے) باقی رہنے والی۔

## دجالی تہذیب میں مادیت اور اس کے علمبراروں کی عظمت و تقدیس

مادی تہذیب (جس کی نمایاں اور موجودہ شکل کو ہم دجالی تہذیب کہہ سکتے ہیں) اس روح اور اس رجحان یا دعوت کی قدم قدم پر مخالفت ہے بلکہ بالکل متوازی و مخالف ہے، وہ مادیت اور اس کے علمبراروں کی عظمت و تقدیس اور ان کی عقیدت و اطاعت پر قائم ہے، اس کا سارا ادب و فلسفہ (تشریفات و صحافت، ناول، ڈرامہ اور تیاتر) کی تمام قسموں اور شعبوں کے ساتھ (سرمایہ داروں اور مادی طاقت اور سیاسی و اقتصادی اقتدار رکھنے والوں کی جاوید بی تعریف اور خوشامد سے بھرا ہوا ہے اور اس نے ان کو خدا کی طرح برتر و بالاتر اور لاثانی و لافانی بنانے کی کوشش کی ہے اور ان کی نقل و تقلید، اطاعت و فرماں برداری اور غلامی و کفش برداری کی ترغیب دی ہے۔

## غلو اور انتہا پسندی اس تہذیب کی خصوصیت ہے

اس انتہا پسند اور انما قبست اندیش تہذیب اور اس کے بہترین نمائندوں اور ذمہ داروں کا اس سے بہتر کوئی وصف نہیں ہو سکتا، جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:-

وَلَا تُطِيعُوا أَهْلَ الْقُلُوبِ عَنِ  
ذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّ أَهْلَ الْقُلُوبِ أَكْفَرُ  
مَطَائِنِ جَسَدٍ غَافِلٍ هُوَ (اور وہ اپنی  
خوہش کے پیچھے بڑھ گیا تو ایسے آدمی کی باتوں پر  
(سورہ کہف - ۲۸)

کان مذہبہم اور جو ہر معاملہ میں اپنے سر پر ہوتا ہے

اسراف، مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی اس تہذیب کی علامت اور شعار بن گئی ہے جس سے

وہ اور اس کے پیروکار پہچانے جاتے ہیں، کماتے ہیں اسراف، لہو و لعب اور تفریح طبع میل اسراف خرچ کرنے میں اسراف، سیاسی و معاشی نظریات میں اسراف، جمہوریت ہو تو اس میں غلو آمریت ہو تو اس میں مبالغہ، اشتراکیت ہو تو اس میں انتہا پسندی، اپنے خود ساختہ قوانین اور مقرر کردہ اصول اور قدریں ہوں تو اس کی ضرورت سے زائد تقدیریں یہاں تک کہ بال برابر اس سے ہٹنا، روا نہیں ہوتا اور اس سے انحراف کرنے والا ایسا مجرم سمجھا جاتا ہے جس کے بعد وہ کسی عزت و شرافت کا مستحق اور کسی احترام کے قابل نہیں رہتا، یا پھر ایسی مجنونانہ اور احتقانہ بغاوت جو عقل، ذوق سلیم اور فطرت انسانی سب کے لئے ناقابل قبول ہے اور جس کے بعد آدمی متمدن انسانوں کی صف سے نکل کر درندوں اور مویشیوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

غرض کہ ہر انتخاب اور ہر پسند میں اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا اور ہاتھ سے نکلا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی ہر تحریک دعوت میں اس کی کرشمہ سازی دیکھی جاسکتی ہے جہاں تک اعتدال و میانہ روی اور توازن کا تعلق ہے اس کے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں اور اس کا حصہ اس میں سبب کم ہے۔

## عدل و اعتدال اس دین کا امتیاز ہے

جو زندگی نبوت کے سرچشمہ سے نکلتی ہے اس کا امتیاز عدل اور اعتدال ہے:-

لے نیارہ چان اور ذہنی رخ یورپ امریکہ کی ان نئی تحریکوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو حیوانی حریت، غریبی اور آزادانہ اختلاط کی داعی ہیں اور جو ان فنون ان مغربی نوجوانوں میں بدرجہ اتم ہو رہے ہیں جن کو ہیپی (HIPPIES) کہا جاتا ہے یہ دراصل ہر اس تمدن کا خاصہ ہے جو مادیت کے ہر حصہ، فکری، جسمانی اور نفسیاتی آکٹاہٹ اور مایوسی کا شکار ہے، یونان اور روم میں ایک زمانہ میں اس سے ملنے جلتے حالات پائے جاتے تھے، اس کا اندازہ افلاطون کی کتاب ریاست سے بخوبی ہوگا جس میں اس عہد کے ایک ایک یونانی نوجوان کی عکاسی کی گئی ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے "انسانی دنیا پر

مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ۴۵-۴۶ ساتواں ایڈیشن۔ از مؤلف

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ  
يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا  
جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں  
نہ بخل، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر  
(سورہ فرقان - ۶۷) قائم رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس قرآنی امت کا وصف اعتدال اور توسط بیان کیا ہے:-

وَلَا جَعَلْنَا كُمُ امَّةً قَسَطًا  
يَتَكَلَّمُونَ أَشْهَادًا عَلَى النَّاسِ وَيَكُونُ  
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا  
اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو  
ہر سلسلے سے نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (یعنی)  
لوگوں کے مقابلے میں گواہ ہو اور تمہارے لئے  
رسول (الشرطہ اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم توسط اور اعتدال کی کامل مثال تھے، دین اسلام کا وصف  
اللہ تعالیٰ نے استقامت و اعتدال اور افراط و تفریط سے بعد بیان کیا ہے اور اس کو کہیں  
”قیم“ کہا ہے اور کہیں ”قیم“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

قُلْ إِنِّي هَدَىٰ رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
ذِي نَافَعٍ مَّا مَلَآئِبُهُ هَيْمٌ حَنِيفًا  
کہو مجھے تو میرے پروردگار نے یہ صراط  
دکھا دیا ہے کہ وہی درست اور صحیح دین ہے

۱۔ سورہ بقرہ ۱۴۳۔ ملاحظہ فرمائیے کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ شرق و مغرب کے درمیان بنایا اسی طرح تم کو افراط و تفریط  
کے درمیان میں رکھا ہے۔ ۲۔ خان میں ہے ”اس کے معنی میں کہ تم کو اس دین کا حامل بنایا جو افراط و تفریط سے پاک  
ہے“ ج ۱ ص ۱۱۱۔ آپ کی میاں روئی و اعتدال کے اوصاف و کمالات اور ہر چیز میں میاں روئی اور اعتدال ملحوظ  
رکھنے کے سلسلے میں آپ کے ارشادات و تعلیمات سیرت کی تمام کتابوں میں مذکور ہیں حضرت علی ابن ابی طالبؓ اس بارہ میں  
کہتے ہیں کہ ”آپ کا ہمیشہ اعتدال کے ساتھ ہونا تھا، نہ حق سے کمی کرتے نہ اس سے تجاوز کرتے وہ کہتے ہیں کہ جبر و کابو  
میں آپ کو انتخاب کرنا ہوتا تو ہمیشہ آسان والا پہلو اختیار فرماتے“ (شمائل ترمذی)

وَمَا كَانَتْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝  
ابراہیم کا طریقہ کہ ایک خدا ہی کے لئے ہو جانا  
(سورہ انعام - ۱۶۱) اور ابراہیم ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

ذَٰلِكَ الَّذِي يُقَيِّمُ (سورہ توبہ - ۳۶) یہی ہے سیدھا دین۔

ایک اور جگہ ہے:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ (سورہ روم - ۴۲) ستم اپنا رخ اس دین راست کی طرف رکھو۔  
کتاب اللہ کو بھی قیّم کہا گیا ہے اور زین اور کچی سے اس کو پاک بتایا گیا ہے اسی سورہ کہف  
کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

أَحْمَدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ  
الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۖ قَيِّمًا  
لِّبَيِّنَاتٍ رَاسًا شَدِيدًا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي  
الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ  
أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا مَا كِشِبْتِي  
فِيهِ آيَاتِهِ ۝

(سورہ کہف - ۱-۳) ہے اور مومنوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں خوشخبری

دیدے کہ یقیناً ان کے لئے بڑی ہی خوشی کا  
اجر ہے ہمیشہ اس میں خوشحال رہیں گے۔

ایک موقع پر ہے:-

رَسُولٌ مِّنْ أَهْلِ بَيْتِهِ أَصْحَابُ مَقَامٍ ۝۱۰  
ایک اللہ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر نساں



فِيهَا كُتِبَ قِيمَتُهُ (سورہ عینہ ۳۱) جس میں درست مضامین لکھے ہوں۔  
دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قَدْ اَنَاوَرْنَا بِمَا غَيَّرَ دِي عَوِجَ لَعَلَّهُمْ  
يَتَّقُونَ ۝ (سورہ زمر- ۲۸) جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے  
جس میں ذرا کمی نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعتدال و حق پرستی کی اسپرٹ اس دین میں پوری طرح جاری  
و ساری اور اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے اس کے تمام قوانین احکام تعلیمات اور اس کا  
کلچر اور ثقافت سب اس کے زیر اثر اور زیر سایہ ہے اس کے برعکس مادی تہذیب (جو یورپ میں  
مذہب اخلاق سے عین بغاوت کے موقع پر وجود میں آئی) اول روز سے توازن سے محروم ہے  
اس کے نظام اجتماعی میں انتہا پسندی، فکر و فلسفہ میں کج روی، علوم و آداب میں مبالغہ آرائی  
اور طوالت، ہر فعل اور ہر اقدام میں مشکل اور طویل راستہ اختیار کرنے کی خواہش اور عادت  
پوری طرح جلوہ گر ہے اس طرح کی تہذیبیں اگر طبائع سلامتی و اعتدال سے عقل حق و  
صداقت کی راہ سے اور زندگی سہولت اور سادگی سے اور قویں وحدت والفت سے  
محروم و نا آشنا رہتی ہیں تو بجائے تعجب نہیں۔

## دو باغ والے کا قصہ

اب قرآن مجید دو باغ والے کا قصہ بیان کرتا ہے یہ وہ قصہ ہے جس سے ہم کو روزمرہ  
کی زندگی میں پہلے قصہ سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے اگر اصحاب کہف کا قصہ صدیوں اور برسوں  
میں پیش آتا ہے تو یہ قصہ تقریباً ہر جگہ اور ہر وقت ہمارے سامنے آتا ہے اور بار بار دہرایا جاتا  
ہے یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ہر اعتبار سے خوش نصیب و اقبال مند تھا، آسائش

و خوشحالی کے سارے سامان اس کے لئے مہیا تھے، اس کے پاس انگوڑیسیے لطیف و مرغوب پھل کے دو باغ تھے، ان کے چاروں طرف کھجور کے و لٹوا زدرخت تھے جنہوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، درمیان درمیان میں کاشت کے قطعے بھی تھے، یہ ایک متوسط درجہ کی زندگی کے لئے سعادت و مسرت کی آخری منزل تھی، اور متوسط طبقہ اور درمیانی معیار زندگی ہی اکثر دنیاوی معاملات میں معیار و پیمانہ ہے۔

لیکن اس دولت مند اور خوشحال شخص کی سعادت و کامیابی کا سارا انحصار محض ان باغات کے وجود تک محدود نہ تھا، بلکہ سارے اسباب و وسائل اس کے لئے مسخر تھے اور یہ دونوں باغ اپنی بہترین پیداوار دے رہے تھے:-

كَلَّمَا الْجَنَّتَيْنِ اَتَتْهُمَا وَلَكُم  
تَطْلُمُ مِنْهُ شَيْءًا وَفَجَزَا لِهَٰمَا  
نَهْرًا

پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے  
پیداوار میں کسی طرح کی کمی کی نہ ہوئی ہم نے  
ان کے درمیان (آب پاشی کے لئے) ایک نہر

(سورہ کہف - ۳۳) جاری کر دی تھی۔

غرض اس طرح سعادت و کامرانی کی پوری تکمیل ہو چکی تھی اور آرام و راحت کے سارے اسباب نہ صرف موجود بلکہ ارزاں و فراوان تھے۔

## مادی نظریات اور ان کی کوتاہ نظری

اس موقع پر اس شخص کے اندر وہ مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے، جو ہمیشہ اہل حکومت، جاگیرداروں، قومی لیڈروں، صنعت کاروں، کارخانہ داروں اور فوجی طاقت رکھنے والوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اس کے اندر وہ شدید مادی رجحان پیدا ہوتا ہے، جو ایمان، معرفت، صحیحہ اور تربیت کا

پابند نہیں وہ اپنی ساری خوشحالی اور خوش بختی کو اپنے علم و لیاقت اور اپنی ذہانت و محنت کی طرف منسوب کرتا ہے جس طرح اس سے پہلے قارون نے کیا تھا، اور کہا تھا:-

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۖ  
(سورہ قصص - ۷۸) یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔

وہ اپنے اس دوست پر فخر کرتا ہے جس کو میرا دیں حاصل نہ تھیں، اور بڑی صراحت بلکہ ناروا جسارت سے کہتا ہے:-

أَنَا الْكَرِيمُ مَلَأَ وَاعْتَزَّنَفْرَاهُ  
(سورہ کہف - ۳۲) دیکھو میں تم سے زیادہ الدار ہوں اور میرا جتنا بھی بڑا طاقتور جتنا ہے۔

وہ اپنے اقتدار و قوت کے سرختمی میں اور دولت و خوشحالی کے اس مرکز میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ نہ اس کو اپنی خبر ہوتی ہے نہ اپنے رب کی، نہ غیبی اسباب اور ارادۃ الہی کی جو سات آسمان سے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے، اور انسان اور اس کی ملکیت بلکہ انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ اپنے نفس پر علمی و علی، اخلاقی اور عقلی ہر لحاظ سے ظلم کرتا ہے، یہ کو خیر شتم مادی ذہنیت اس کی زبان سے اعلان کرواتی ہے کہ اب نہ اس کو زوال ہے نہ اس کے باغات کو، وہ شرف و شرف کا انکار کرتا ہے اور بڑے پھوپھو ہٹن اور غایت درجہ حماقت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ یہ کامیابی و خوشحالی ابدی ولافانی ہے، اور دنیا و آخرت (اگر آخرت ہو) کسی جگہ ختم ہونے والی نہیں ہے:-

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۖ  
قَالَ مَا أَطْلَعْتُ أَنِّي تَبِيدُ هَذِهِ الْأَبَدُ ۖ  
وَمَا أَطْلَعْتُ السَّاعَةَ فَأَتَمَّتْ  
کہا نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ بھی ویران ہو سکتا ہے مجھے تو یہ نہیں کہ (قیامت کی گھڑی

(سورہ کہف - ۳۵-۳۶)

برپا ہو۔

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا شمار ان معدودے چند خوش نصیب کا مران افراد انسانی میں ہے جن سے اقبال کبھی منہ نہیں موڑتا اور قسمت کبھی بے وفائی نہیں کرتی اور جو ہمیشہ اور ہر جگہ سعادت اور عزت کے بام عروج پر نظر آتے ہیں:-

وَلَيْسَ رُحْدُوتٌ اِلٰى رَبِّىْ لَاحِدَةً  
خَيْرٌ لِّمَنْهَا مُقَلَّبًا  
اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار  
کا طرٹ لوٹا گیا تو (میرے لئے کھٹکا ہے)  
(سورہ کہف - ۳۶) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانہ ملے گا۔

اس طرح کے لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان، عمل صالح، اور محنت و کاوش کی کیا ضرورت ہے، یہ ان کی فطری اور وہی سعادت ہے جو ہر وقت ان کو شاد کام و بامراد رکھ سکتی ہے۔

### ایمانی طرز فکر

اس کے دوست کی چشم بصیرت اللہ تعالیٰ نے حق و ایمان کے لئے کھول دی تھی، اس کو معرفت الہی اور اس کے صفات و افعال کے علم کی لازوال دولت حاصل تھی، وہ جانتا تھا کہ صرف وہی اس کائنات میں تصرف کرنے والا ہے اور اسباب کا خالق ہے اور جب چاہے حالات کو پلٹ سکتا ہے، اس نے اس کی اس بات پر اعتراض کیا اور اس کے اس مادہ پرستانہ طرز فکر کی کھل کر مخالفت کی، اس کو اصل و حقیقت اور آغاز سے آگاہ کیا، یہ وہ سخت اور سنگین حقیقت ہے جس کو یہ ظاہر پرست اور اپنے کو خوش نصیب سمجھنے والے ہمیشہ فراموش کرنا چاہتے ہیں اور اس کے تذکرہ سے دور بھاگتے ہیں:-

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ  
اَلْكَفَرْتُ بِالْبَدِئِ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ  
یہ کہ اس کے دوست نے کہا اور باہم  
گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کیا تم اس بتی کا

ثُمَّ مِنْ ثُفَّةٍ ثُمَّ سَوَاحٍ رَجُلًا  
انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی سے  
(سورہ کہف - ۳۷)  
اور پھر نطفہ سے پیدا کیا، اور پھر آدمی بنا کر  
نمودار کر دیا؟

تکبر و مغرور اشخاص کے لئے اس بات کا سنا کتنا شاق و ناگوار ہے اس کا اندازہ  
ہم کر سکتے ہیں، اس نے کہا کہ وہ اس کے بالکل دوسرے رخ پر ہے اور دوسرے رجحان  
کا حامل ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان :-

لَيْسَ أَهْوَاؤُهُ رَبِّي وَلَا أَشْرَافُ  
لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ  
میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار  
بِرَبِّي أَحَدًا  
(سورہ کہف - ۳۸) کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

پھر اس نے اس کو وہ بنیادی اور اصولی حقیقت یاد دلائی جس کے گرد پوری سورہ کہف  
گردش کر رہی ہے اور اس جگہ انگلی رکھی جو اس طرح کے لوگوں کی کمزوری یا کھتی رگ ہوتی  
ہے اس نے کہا کہ دیکھنے کی چیز اسباب ظاہری نہیں بلکہ وہ خالق و مالک ہے جس کے ہاتھ  
میں ان سارے اسباب و وسائل کی ڈور ہے اور یہ سامان راحت اور اسباب عیش جن پر وہ  
خوش اور نازاں ہے نہ اسباب کی کارگزاری ہے اور نہ خود اس کی دست کاری یا عقل  
و ذہانت کی کار فرمائی، وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا نتیجہ ہے جس نے ہر چیز کو بہتر  
طریقہ پر بنایا ہے، وہ بڑی حکمت اور نرمی کے ساتھ اس کو خدا کی قدرت کے اعتراف  
اور اس کی نعمت کے شکر کی طرف متوجہ کرتا ہے :-

دَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ  
اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس  
قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ  
کی شادایاں دیکھیں) تو کیوں تم نے

لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ۝  
یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے  
(سورہ کہف - ۳۹) اس کی مدد کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

## سورہ کی روح اور قصہ کی کلید

”مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ دراصل اس سورہ کی روح اور سائے قصہ کی جان ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اور آپ کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے والے کو اس کی ترغیب دی تاکہ وہ اپنا سارا معاملہ اور ساری طاقت و صلاحیت کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے اور مستقبل کے ہر ارادہ اور نیت کو اس کے سپرد اور اس کی مشیت کے ساتھ مشروط اور وابستہ رکھے۔

وَلَا تَقْوِيَنَّ تِلْكَ اِلٰى فَاَعْلٰى ذٰلِكَ  
عَدَاوَالِاِنَّ يَشَاءُ اللّٰهُ زَوَادُكَ  
رَبِّكَ اِذَا نَشِيتَ وَقُلْ عَسٰى اَنْ  
يَهْدِيَنِّي رَبِّيْ لَاقْرَبَ مِنْ هٰذَا  
رَشْدًا ۝

اور کوئی بات ہو، مگر کبھی ایسا نہ کہو میں کل  
اسے ضرور کر کے رہوں گا ”الایہ کہ سمجھ لو، ہو گا  
وہی جو اللہ چاہے گا، اور جب کبھی بھول جاؤ  
تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر لو، تم کہو  
”امید ہے، میرا پروردگار اس بھی زیادہ  
راہ چھپ چھول دے گا“

(سورہ کہف - ۲۳-۲۴)

اور ہر موقع پر دل سے ماشاء اللہ اور انشاء اللہ کہتا ہو۔

جو شخص ہر فضل و کمال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہو اور ہر نیت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہو اور اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہو وہ اسباب ظاہری، مادیات اور مادہ پرستوں کے سامنے اپنا سر کیسے جھکا سکتا ہے اور نفس اور نفسانی ارادہ کے ہاتھ میں اپنی زمام کار کیسے دے سکتا ہے؟

”مَا شَاءَ اللَّهُ“ اور ”إِن شَاءَ اللَّهُ“ بظاہر دو بڑے ہلکے پھلکے لفظ ہیں اور اکثر ان کا استعمال بغیر سوچے سمجھے کیا جاتا ہے اور اس کے پیچھے کوئی احساس و شعور نہیں ہوتا لیکن درحقیقت یہ دونوں بڑے وزنی، بڑے گہرے اور معانی و حقائق سے لبریز بول ہیں اور اندھی مادیت نفس اور ارادۃ انسانی پر بھروسہ و اعتماد پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

### مادی تہذیب کا اپنے وسائل و اسباب پر اعتماد

مادی تہذیب اپنے وسائل اور ذرائع قوت پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد میں مبتلا ہے یہ مادی حکومتیں اپنے ان عمرانی و اقتصادی منصوبوں کا برابر اعلان کرتی رہتی ہیں جو قدرت کی ہم آہنگی اور موسموں کے تغیرات سے تعلق رکھتی ہیں، وہ بڑی طبیعت کے ساتھ اس کی مدت اور اس کا حجم متعین کرتی ہیں اور یہ طے کرتی ہیں کہ وہ اتنے سال کے اندر اتنی پیداوار ضرور پیدا کرنے لگیں گی، اور ان کے ملک خود کفیل ہو جائیں گے اور بیرونی امداد پر ان کا انحصار ختم ہو جائے گا لیکن ارادۃ الہی ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے کبھی قحط سے واسطہ پڑتا ہے، کبھی سیلابوں سے کبھی بارش بہت تاخیر سے ہوتی ہے، کبھی اس قدر مسلسل کہ کھڑی کھیتیاں غرق ہو جاتی ہیں ایسے قدرتی حوادث اور جان و مال کے مصائب سامنے آتے ہیں جو حاشیہ خیال میں نہ آ سکتے تھے، غرض کہ ان کے سارے اندازے غلط اور منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ منصوبے بنائے ہی نہ جائیں اور علم کی بنیادوں پر اضافہ پیداوار کی کوئی کوشش نہ کی جائے بلکہ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ طاقت کے یہ مظاہر اور معلومات کی کثرت ہمارے اندر سرکشی نہ پیدا کرے اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال ہمارے ذہنوں سے نکل نہ جائے جو ان اسباب و مسببات سب کا خالق ہے۔

## ارادۃ الہی پر ایمان و اعتماد

یہ انشاء اللہ دراصل ہماری انفرادی زندگی کے چھوٹے اور حقیر کاموں پر سرسری ملاحظوں اور مفروضوں یا محض تائید کے تعین کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ ان تمام اجتماعی کاموں اور عظیم منصوبوں پر ہادی ہے جو پوری قوم کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے ان سب چیزوں کو (بشمول بعد و بعد اسباب و وسائل کی اہمیت اور قرآن و سنت السوۃ نبوی اور علی صحابہ کی روشنی میں تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت کے) اس یقین کے ماتحت ہونا چاہئے کہ فیصلہ کن بالاتر اور اول و آخر چیز ہر صورت ارادۃ الہی ہے اس آیت میں :-

وَلَا تَقْنُوتُمْ شَيْئًا إِلَىٰ قَائِلٍ ۚ إِلَّا  
عَذَابُ اللَّهِ ۚ الْآنَ يَشَاءُ اللَّهُ

اور کوئی بات ہو، مگر کبھی ایسا نہ کہو میں کل  
اسے ضرور کر کے رہوں گا، الا یہ کہ سمجھ لو

(سورہ کہف - ۲۳، ۲۴) ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا:

صرف ایک فروغِ طیبہ نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ کا معاشرہ تمام حکومتیں، ادارے اور جماعتیں اور تحریکیں مخاطب ہیں اور ان سب کے اہتمام و التزام کا مطالبہ ہے یہ ہر اس اسلامی معاشرہ کی روح ہے جس میں ایمان اچھی طرح سرایت کر چکا ہو اور اس تہذیب کی روح اور جوہر حیات ہے، جو ایمان بالغیب کی بنیاد پر قائم ہو اور یہی وہ خطِ فاصل ہے، جو مادی تمدن اور ایمانی تمدن کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

یہ صاحبِ ایمان ساتھی اس کو متنبہ کرتا ہے کہ قسمتوں کا الٹ پھیر اور خوش نصیبی و بد نصیبی کی تقسیمِ ابدی اور ناقابلِ شکست نہیں، زمام کار اور تصرف و اقتدار کا اختیار خالقِ کائنات کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں چکا وہ اب بھی اس کا مالک ہے، خوش نصیبِ قدمت



ہو جاتا ہے، اور بد قسمت خوش نصیب، مالدار غریب بھی ہو سکتا ہے، اور غریب مالدار بھی اس لئے اگر حالات پلٹ جائیں تو اس میں تعجب نہ ہونا چاہئے :-

إِن تَرَىٰ أَنَا أَقْلَمَ مِنْكَ مَا لَوْ وَلَدَاهُ  
فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُوْتِيَنِي خَيْرًا مِّنْ  
جَنَّتِهِ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ  
السَّمَاءِ فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا أَوْ  
يُصْبِحُ مَاوًا حَامًّا فَلا تَسْتَطِيعُ  
لَهُ طَلِبًا

اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر  
پارہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری  
جنت سے بہتر عطا فرمائے، اور تیری  
جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیجے  
جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے  
یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر

(سورہ کہف - ۳۹ تا ۴۱) تو اسے کسی طرح ذنکال سکے۔

اور آخر کار یہی ہوا خدا کی بھیجی ہوئی ایک آندھی آئی اور دیکھتے دیکھتے یہ اہلہاتا ہوا  
گلزار چٹیل میدان بن گیا۔

اب اس مست و بے خود شخص کو ہوش آیا :-

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ  
كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ  
خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ  
يَلْبِثُنِي لَمْ أَشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا  
وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِن  
دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا  
هَٰذَا لِلَّذِينَ آلَوا الْكُفْرَ هُوَ خَيْرٌ

اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اس کی  
دولت زربادی کے گھیرے میں آگئی وہ  
ہاتھ مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان باغوں  
کی درنگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا (وہ  
سب برباد ہو گیا) اور باغوں کا یہ حال  
ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہو گئیں  
اب وہ کہتا ہے، اے کاش میں اپنے پورے

ثَوَابًا وَخَيْرٌ عَقْبًا ۝

(سورہ کہف - ۴۲ تا ۴۴)

کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، اور دیکھو  
کوئی جنتخانہ ہو کہ اللہ کے سوا اس کی مدد  
کرتا اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ  
بربادی سے جیت سکتا! یہاں سے معلوم  
ہو گیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی  
کے لئے ہے وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا  
ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے۔

## دوباغ والے کا شرک

یہ باغ والا اس طرح کا مشرک نہیں تھا جس طرح عام مشرکین ہوتے ہیں، قرآن کے  
نص یا اشارہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے برعکس قرآن کے اسلوب اور انداز کلام  
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا تھا۔

وَلَقَدْ رُودَتْ إِلَىٰ رَبِّهِ لَاجِدَةً ۝

خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلِبًا ۝

(سورہ کہف - ۳۶)

ہے؟ مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے  
بہتر ٹھکانہ ملے گا۔

پھر اس کا وہ مشرک کیا تھا جس پر اس نے کف افسوس ملا اور مذمت کا اظہار کیا ہے۔

يَلْبِسُنِي لَمَّا شَرِكْتُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

(سورہ کہف - ۴۲)

کسی کو شریک نہ کرتا۔

وہ ظاہری بات جس میں اشکال کی کوئی وجہ نہیں یہ ہے کہ اس نے اسباب میں شرک اختیار کیا تھا، اور یہ سمجھتا تھا کہ اس کی ساری خوشحالی و دولت کا سرچشمہ یہی اسباب ظاہری ہیں، اور یہ انھیں کا ثمرہ اور احسان ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا اور اس کے تصرف اور تاثیر کا منکر ہو گیا۔

## عہد حاضر کا شرک

یہی وہ شرک ہے جس میں موجودہ مادی تہذیب مبتلا ہے، اس نے طبعی مادی اور فنی اسباب اور ماہرین فن (SPECIALISTS) کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے، عہد حاضر کے انسان نے اپنی پوری زندگی ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت کا میاں بی ونا کامی، اقبال و ادبار، خوش نصیبی و بد نصیبی سب ان کے ہاتھ میں ہے اسباب مادی، کائناتی قوتوں اور نیچر کی یہ پرستش و تقدس اور اہل اختصاص اور ماہرین فن پر اعتماد کلی اور ان کو خدا کے درجہ پر رکھنا ایک نئی وثنیت اور نیا شرک ہے اس نے قدیم بت پرستی کے ذخیرہ میں جس کا ترکہ اس کے پاس اب بھی محفوظ ہے، اور جس کے ماننے والے اور چاہنے والے اب بھی بکثرت موجود ہیں، ایک نئی قسم کی بت پرستی کا اضافہ کیا ہے، جو ایمان اور عبدیت کی حریف ہے، اور یہ وہی وثنیت ہے جس کو سورہ کہف نے چیلنج کیا ہے، اور جس سے وہ پوری طرح برسرِ پیکار ہے۔

قرآن مجید اس دنیا کی زندگی کو اس کھیتی سے تعبیر کرتا ہے جو جلد ہی ٹٹنے والی اور خاک میں مل جانے والی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (اے پیغمبر!) انھیں دنیا کی زندگی کی

مَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ  
بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا  
تَذَرُوهُ الرِّيحُ وَكَانَ اللَّهُ  
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُقْتَدِرًا  
(سورہ کہف - ۴۵)

مثال سادو اس کی مثال ایسی ہے جیسے  
(زمین کی روئیدگی کا معاملہ) آسمان سے  
ہم نے پانی برسایا، اور زمین کی روئیدگی  
اس سے مل جل کر ابھرائی (اور خوب پھل  
پھولی) پھر (کیا ہوا؟ یہ کہ) سب کچھ سوکھ  
چورا چورا ہو گیا، ہوا کے جھونکے اسے اڑا کر  
منتشر کر رہے ہیں! اور کونسی بات ہے  
جس کے کرنے پر اللہ قادر نہیں؟

قرآن مجید نے دوسری جگہوں پر بھی اس مختصر اور فانی زندگی کی یہی تصویر کھینچی ہے

سورہ یونس میں ہے:-

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ  
مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ  
مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ فَهِيَ إِذَا  
أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازْبَيَّتْ  
وُظُنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِرُونَ عَلَيْهَا  
أَنَّهُمْ أَمْرًا بَالِغًا أَوْ نَهَارًا فَنَجَعَلُهَا  
حَصِيدًا كَانَتْ لَمْ تَغْنَى بِالْأَمْسِ  
كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ  
يَتَفَكَّرُونَ ۝ (سورہ یونس - ۲۴)

دنیا کی زندگی کی مثال تو بس ایسی ہے۔  
جیسے یہ معاملہ کہ آسمان سے ہم نے پانی برسایا  
اور زمین کی نباتات جو انسانوں اور چارپایوں  
کے لئے غذا کا کام دیتی ہیں اس سے شاداب  
ہو کر پھل پھولیں، اور باہم گول گئیں، پھر  
جب وہ وقت آیا کہ زمین نے اپنے (سبزی  
اور لالی کے) سارے زیور بہن لئے، اور  
لہلہاتے کھیتوں اور گراں بار باغوں سے)  
خوشنما ہو گئیں، اور زمین کے الگ سمجھے اب

فصل ہمارے قبضہ میں آگئیں تو اچانک  
 ہمارا حکم دن کے وقت یا رات کے وقت  
 نمودار ہو گیا اور ہم نے زمین کی ساری فصل  
 اس طرح بیج و بن سے کاٹ کے رکھ دی  
 گویا ایک ن پہلے تک اس کا نام و نشان ہی  
 نہ تھا اس طرح ہم (حقیقت کی) بلبلیں  
 کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں ان لوگوں  
 کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔

قرآن کی نظر میں اس زندگی کی جس کی ابدیت پر یہ مادہ پرست ایمان لائے ہیں  
 اور جس کو منفعت پرستوں اور لذت پسندوں (EPICUREANS) نے اپنا مرکز اور معبود  
 بنایا ہے، صرف اتنی ہی حقیقت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ ان پیانوں اور پیائشوں کو  
 غلط و بے بنیاد قرار دے کر (جن پر ان تنگ نظر ظاہر پرستوں اور اسباب کے گرفتاروں نے  
 پورا اعتماد کر رکھا ہے، اور اس سے بڑی بڑی توقعات اور آرزوئیں قائم کر لی ہیں) ایسا  
 پیانوں کو قابل تہجیح اور معیار صحیح قرار دیتا ہے:-

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ  
 الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ  
 خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا  
 (سورہ کہف - ۴۶)

مال و دولت اور آل و اولاد دنیوی زندگی کی  
 دلفریبیاں ہیں (مگر چند روزہ ناپائیدار)  
 اور جو نیکیاں باقی رہنے والی ہیں تو وہی تمہارا  
 پروردگار کے نزدیک باعتبار ثواب کے بہتر ہیں  
 اور وہی ہیں جن کے نتائج سے بہتر امید رکھی جاسکتی

## دنیا کی زندگی قرآن کی روشنی میں

یہاں ایک لمحہ توقف کر کے ہمیں سوچنا چاہئے کہ دنیا کی زندگی کو قرآن مجید کس نگاہ سے دیکھتا ہے، مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں صرف قرآن ہی سے رجوع کیا جائے اس لئے کہ اس بارہ میں مسلمانوں کے افکار میں بڑا اضطراب و پریشاں نظری ملتی ہے اور اہل فکر کے رجحانات اس زندگی کی اصل قدر و قیمت کے بارہ میں مختلف ہیں۔

قرآن مجید بڑی وضاحت، طاقت اور صراحت کے ساتھ اس زندگی کے اختصار و بے ثباتی اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی بے وقتی کا اظہار اور اعلان کرتا ہے۔ ایک جگہ آتا ہے:-

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ  
الْأَقِيلُ (سورہ برأت - ۳۸)

دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے، مگر بہت تھوڑی۔

ایک اور جگہ:-

إِنَّمَا أَمَّا الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لَمَلْعَةٌ وَلَهُوَ  
وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَكِبَارٌ  
فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ مِثْلُ غَيْثٍ  
أَخْجَبَ الْغَمَامِ رَبَانَةٌ ثُمَّ يَذَرُهُمْ  
فَتَرَاهُمْ مَصْفَرًّا أَتَمَّ يَكُونُ حُطَّاءَ  
وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ  
وَمَعْقَرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِصُونٌ وَمَا

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں)  
دنوی حیات محض لہو و لعب اور (ایک)  
ظاہری (زینت اور باہم ایک دوسرے پر)  
فخر کرنا اور اموال اور اولاد میں ایک کا  
دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے  
جیسے مینہ (برتا) ہے کہ اس کی پیداوار  
(کھیتی) کا شکاروں کو ابھی معلوم ہوتی ہے

الْحَيَاةُ الدُّنْيَا الْآمَتَاعُ الْغُرُورُ ۝  
پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زبردست

ہے، پھر وہ چور چور ہو جاتی ہے اور آخرت (سورہ حدید۔ ۲۰)

(کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں عذاب

شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت

اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگی

محض دھوکے کا اسباب ہے۔

وہ بڑی قوت اور صفائی کے ساتھ اس کو آخرت کا صرف ایک پل اور عمل کا ایک

موقع قرار دیتا ہے:-

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً ۝  
روئے زمین میں جو کچھ بھی ہے اسے ہم نے زمین

لَهَا لِيُتَلَوُوهُمْ أَتَاهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝  
کی خوشنالی کا موجب بنایا ہے اور اس لئے

بنایا ہے کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں، (سورہ کہف۔ ۷)

کون ایسا ہے جس کے کام سب سے زیادہ اچھے

ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَتْلُوَكُمْ ۝  
جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ

أَتِلُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ ۝  
تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل

الْغَفُورُ ۝  
میں زیادہ اچھا ہے اور وہ زبردست

(اور) بخشنے والا ہے۔ (سورہ ملک۔ ۲)

وہ آخرت کو دائمی اورابدی قرار دیتا ہے:-

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَهْوٌ  
وَاللَّذَائِجُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّذِي بَيِّنَاتٍ  
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝  
(سورہ النعام - ۳۲)

اور دنیا کی زندگی تو کچھ نہیں ہے مگر ایک  
طرح کا کھیل اور تماشہ اور جو توفیق ہیں تو  
یقیناً ان کے لئے آخرت ہی کا گھر بہتر ہے  
(انفوس تم پر!) کیا تم (اسی بات بھی)  
نہیں سمجھتے؟

دوسری جگہ یہ ارشاد ہے:-

وَمَا أُوتِيتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَّعَ الْحَيَاةِ  
الدُّنْيَا وَزَيَّنَّهَا ۖ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ  
خَيْرٌ ۚ وَالْآخِرَةُ أَفْلَا تَعْقِلُونَ ۝  
(سورہ قصص - ۶۰)

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا  
کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے  
اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور  
باقی تر ہے کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔

وہ ان لوگوں کی سخت مذمت کرتا ہے جو اس فانی، عارضی، اور سقیم و ناقص دنیا کو  
اس آخرت پر ترجیح دیتے ہیں جو ابدی و لازوال ہے، بے حدود و بے کراں ہے، ہر حکم و رت سے  
پاک اور ہر اندیشہ سے محفوظ و بالاتر ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ رِضَاَنَا وَتَوَلَّوْا  
بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْهَمَامُ أَتَاهَا ۖ وَالَّذِينَ  
هُمْ عَنِ الْآخِرَةِ أَفْلَا تَعْقِلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ  
مَأْوَاهُمْ النَّارُ ۖ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝  
(سورہ یونس - ۸-۷)

جو لوگ (مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع  
نہیں رکھتے صرف دنیا کی زندگی ہی میں لگ  
ہیں اور اس حالت پر مطمئن ہو گئے ہیں اور  
جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں تو  
ایسے ہی لوگ ہیں جن کا (آخری) ٹھکانہ  
دوزخ ہو گا، یہ سبب اس کمائی کے جو (خود)



اپنے علموں ہی کے ذلیعہ) کلاتے رہتے ہیں۔

دوسری جگہ کہتا ہے:-

مَنْ كَانَ يُؤَيِّدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا  
فَنَبِّئْهَا نُوفًا إِلَيْهِمْ أَعْمَاءَهُمْ  
فِيهَا هُمْ فِيهَا لَا يُنْفَعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ  
الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ  
وَصِطَمَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَ بَاطِلٌ مَّا كَانُوا  
يَعْمَلُونَ ۝

جو کوئی (صرف) دنیا کی زندگی اور اس کی  
دلفریبیاں ہی چاہتا ہے تو (ہمارا ٹھہرایا  
ہوا قانون یہ ہے کہ) اس کی کوشش و عمل  
کے نتائج یہاں پورے دے دیتے ہیں ایسا  
نہیں ہوتا کہ دنیا میں اس کے ساتھ کسی  
کی جائے لیکن (یاد رکھو) یہ وہ لوگ ہیں  
جن کے لئے آخرت (کی زندگی) میں (دو فح  
کی) آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا، جو کچھ انھوں نے  
یہاں بنایا ہے سب کارت جائے گا، اور  
جو کچھ کرتے رہے ہیں سب نالودھونے والا ہے!

(سورہ ہود - ۱۵-۱۶)

ایک اور موقع پر آتا ہے:-

قُلْ لِّلْكَافِرِينَ مِنِّي عَذَابٌ شَدِيدٌ  
الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى  
الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ  
وَيَعْبُدُونَ مَا جَاءَ ۝ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ  
بَعِيدٍ ۝ (سورہ ابراہیم - ۲-۳)

اور عذاب سخت کی خرابی ہے ان منکروں کے  
لئے جنھوں نے آخرت چھوڑ کر دنیا کی زندگی پسند  
کر لی، جو اللہ کی راہ سے انسانوں کو روکتے  
ہیں اور چاہتے ہیں اس میں کجی ڈالیں یہی  
لوگ ہیں کہ بڑی گہری گمراہی میں جا پڑے۔

دوسری جگہ ہے:-

یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (سورہ روم-۴)  
 لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے خود ہی غافل ہیں۔  
 ایک اور جگہ ہے:-

فَاعْرِضْ عَنْ مَّا تَلَوَّيْتَ لَكَ ذِكْرًا لَّكَ يَوْمَئِذٍ إِلَهٌ نَّظِيرُهُم مِّنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن مَّزَّلَ عَنْ سَبِيلِهِ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن اهْتَدَىٰ

(سورہ نجم-۲۹-۳۰)  
 تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیا کی زندگی کے اس کو کوئی (اخریٰ مطلب) مقصود نہ ہو ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی (دنوی زندگی) ہے تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے رستے سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ راست پر ہے۔

ایک اور جگہ ہے:-

إِنَّ هَؤُلَاءِ يُجِبُّونَ الْعَاقِلَةَ وَيَذَرُونَ ذُرَاةً هُمْ كَوَيْمَاتٍ قَبْلَهُ (سورہ انسان-۱۲)  
 یہ لوگ نیاسے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنے والے) ایک بھاری دن کو بھجور ٹھیکے ہیں۔

ایک جگہ آتا ہے:-

فَأَمَّا مَن طَغَىٰ فَوَاشٍ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَاتَّخِذْ يَوْمَئِذٍ الْمَوْتَىٰ

(اس روز یہ حالت ہوگی کہ جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا) منکر ہو کر) دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی (سورہ نازعات-۳۷ تا ۳۹)  
 سود و فحش (اس کا) ٹھکانا ہوگا۔

وہ ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو دنیا و آخرت کو باہم جمع کرتے ہیں، لیکن آخرت کو

ترجیح دیتے ہوئے اور اس کی صحیح اہمیت اور قیمت پہچانتے ہوئے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا  
فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ  
خَلَاقٍ ۚ وَمِمَّن مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا  
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً  
وَقَدْ عَادَتْ النَّارُ  
(سورہ بقرہ۔ ۲۰۰-۲۰۱)

اور پھر (دیکھو) کچھ لوگ تو ایسے ہیں (جو صرف  
دنیا ہی کے پرستار ہوتے ہیں اور) جن کی  
مدائے حال یہ ہوتی ہے کہ پروردگار! ہمیں  
جو کچھ دینا ہے دنیا ہی میں دے دے  
پس آخرت کی زندگی میں ان کے لئے کوئی  
حصہ نہیں ہوتا، اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو (دنیا و)

آخرت دونوں کی صلاح چاہتے ہیں (وہ)  
کہتے ہیں پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی  
دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور  
ہمیں عذاب آخرت سے بچائے۔

حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے:-

وَالْتَبَّ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً  
وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُنَا أَيْتُكَ  
(سورہ اعراف۔ ۱۵۶)

اور (خدا یا) اس دنیا کی زندگی میں بھی  
ہمارے لئے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی  
زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر ہم  
تیری طرف لوٹ آئے۔

اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَأَيَّدَنِي فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَآتَنِي فِي الْآخِرَةِ  
اسے دنیا میں بھی بہتری دی اور بلاشبہ آخرت

بِسْمِ الصَّالِحِينَ ۝ (سورہ نحل ۱۲۲) میں بھی اس کی جگہ صراحہ انسانوں میں ہوگی۔

## آسمانی مذاہب اور مادی فلسفوں کا فرق

یہاں آسمانی مذاہب، نبوت کی تعلیمات یا نبوت کا مدرسہ فکر (اگر تعبیر غلط نہ ہو) مادی فلسفوں اور اس مادہ پرستانہ طرز فکر سے کلیتہً مختلف اور متصادم ہے جس کا اصرار ہے کہ یہی زندگی سب کچھ ہے اور جس کی عظمت و تقدس فکر و اہتمام، انہماک و محویت اور اس کو زیادہ سے زیادہ پُر راحت اور پُرشش بنانا اس کا سب سے بڑا اور محبوب مقصد ہے۔ وہ نقطہ نظر یا نفسیات جو قرآن دنیاوی زندگی کے بابے میں پیدا کرنا چاہتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اقوال میں پوری طرح نمایاں اور جلوہ ریز ہے۔ آپ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:-

اللهم لا عيش الا عيش الآخرة<sup>۱</sup> اے اللہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

آپ کی دعا یہ تھی:-

اللهم اجعل رزق ال محمد قوتاً<sup>۲</sup> اے اللہ! محمد کا رزق ضرورت بھر رکھا لیک

وفی رواية كفاً<sup>۳</sup> روایت میں ہے کہ بس اتنا کہ کفایت کر جائے،

مستور دین شداد سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:-

والله ما الدنيا في الآخرة الا مثل<sup>۴</sup> خدا کی قسم دنیا آخرت کے مقابلہ میں اتنی ہی ہے

ما يجعل احدكم اصبعه في اليم<sup>۵</sup> جیسے تم میں سے کوئی سمندر میں اپنی انگلی ڈالے

۱۔ صحیح بخاری (کتاب الرقاق) ۲۔ صحیح مسلم (کتاب الزہد)

فلینظریم درج ۱۰

پھر دیکھو کہ کتابانی اس میں آئے ہیں۔

آپ کی پاک زندگی اسی عقیدہ اور نفسیات کا شفاف آئینہ یا عکس تھی۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر آرام فرماتے، اور چٹائی کا اثر آپ کے جسم مبارک پر ظاہر تھا، ابن مسعود نے کہا یا رسول اللہ آپ حکم فرماتے تو کوئی چیز اس پر بچھا دی جاتی، اس پر آپ نے فرمایا ”مجھے دنیا سے کیا کام! میری اور دنیا کی مثال تو بس اس سوار کی ہے، جو کسی درخت کے سایہ میں تھوڑی دیر کے لئے دم لے لے پھر اس کو چھوڑ کر اپنی راہ لے“

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حدیث ایلاء میں فرماتے ہیں ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، آپ ایک بٹی ہوئی چٹائی پر آرام فرماتے، آپ کے اور چٹائی کے درمیان کوئی بچھونا نہ تھا، چٹائی کے نشیب و فراز اور چٹائی کا اثر آپ کے پہلو میں ظاہر تھا“ آپ چمڑے کے ایک تکیہ پر جس میں بھرا ہوا تھا، ٹیک لگائے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا (کچھ تفصیل کے بعد آگے کہتے ہیں) میں نے گھر پر ایک نظر ڈالی، خدا کی قسم اس میں کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ نگاہ کو متوجہ کرتی، اسوائے چمڑے کے تین ٹکڑوں کے، میں نے کہا یا رسول اللہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو فراخی عطا فرمائے، ایرانیوں اور رومیوں کو تو خوب دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا، ابن خطاب! تم بھی ایسا سوچتے ہو؟ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی نعمتوں کا سارا حساب اسی دنیا میں چکا لیا ہے“

۱۰ صحیح مسلم ۱۵ احمد ترمذی، ابن ماجہ ۳۵ صحیح بخاری ج ۲ (کتاب النکاح)

## مدرسۂ نبوت کے طالب علم اور ان کا کردار

جو شخص اس مدرسۂ نبوت میں تربیت پاتا تھا، وہ اس رنگ میں رنگ جاتا تھا اور آخرت کی فکر ہر وقت اس کے ذہن و دماغ پر چھائی رہتی تھی بلکہ اس کے جان و دل میں پیوست اور خون کے اندر شامل ہو جاتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ آخرت کے کسی وقت بھی غافل نہ ہوتا تھا اور اس کے بدلہ میں کوئی اور چیز لینے پر تیار نہ تھا، مدرسۂ نبوت کے ان تلامذہ اور فضلاء کی اسپرٹ اور روح کو سمجھنے کے لئے جو ان کے قلب و دماغ پر حاوی اور رگوں میں خون کی طرح جاری و ساری تھی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوصاف و کیفیات کا مطالعہ کافی ہے، یہ اس انسانی نمونہ اور طرز کی بولتی ہوئی تصویر ہے، جو مدرسۂ نبوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن شفقت اور آغوش رحمت میں پرورش پائی تھی۔

ابوصالح سے روایت ہے "حضرت معاویہ بن ابوسفیان نے حضرت صہاب بن ضمیرہ سے یہ فرمائش کی کہ علیؑ کا کچھ حال بیان کرو، انھوں نے کہا، کیا مجھے اس سے معاف رکھا جاسکتا ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں، ان کے کچھ اوصاف بیان کرو، انھوں نے کہا کہ کیا آپ مجھے معاف رکھیں گے، کہنے لگے نہیں، اس سے معافی نہیں ہے، انھوں نے کہا اچھا تو سنئے! خدا کی قسم وہ بہت بلند نگاہ اور قوی و توانا تھے، صاف اور واضح بات کہتے اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے، علم ان کے ہر پہلو سے چشمہ کی طرح ابلتا اور حکمت ان کے ہر جن میں سے گویا تھی، دنیا اور اس کی زمینت سے متوحش اور رات اور اس کے اندھیرے سے نالوس، بخدا وہ بہت رونے والے اور بہت فکر مند تھے، اپنی ہتھیلی پلٹتے اور اپنے نفس کو خطاب کرتے، لباس ان کو وہ پسند تھا، جو موٹا ہو، کھانا وہ مرغوب تھا، جو بہت معمولی اور روکھا پھیکا ہو، ہمارے

درمیان اس طرح رہتے جیسے ہم میں سے ایک ہوں، ہم سوال کرتے تو فوراً جواب دیتے، ہم آتے تو سلام میں سبقت کرتے اور بڑھ کر استقبال کرتے، ہم بلاتے تو فوراً آجاتے، لیکن ہم ان کو اس دلہناری اور ان سے اس قرب و تعلق کے باوجود رعب کی وجہ سے ان سے ٹھیک سے بات بھی نہ کر سکتے تھے، ان کی عظمت کی وجہ سے ان پر سبقت نہ لے سکتے تھے، ہسکرتے تو معلوم ہوتا کہ موتیوں کی کوئی آبدار لٹمی ہے، اہل دین اور مساکین کی عزت کرتے، کسی طاقتور کو ان سے غلط فیصلہ کی توقع نہ تھی، اور کوئی کمزور ان کے انصاف سے مایوس نہ تھا، میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کو بعض خاص اوقات میں اس طرح دیکھا ہے کہ رات اپنے بیاہ پرے ڈال چکی تھی، اور تنہا بے بھی ڈھل چکے تھے، وہ اپنے مصلیٰ پر کھڑے تھے، اپنے ہاتھ سے اپنی داڑھی پکڑتے اور اس طرح تڑپتے اور بے چین ہوتے جیسے سانپ نے ان کو ڈس لیا ہو، ایک غمزدہ انسان کی طرح رفتے، اس وقت بھی میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں، اے دنیا کیا تو میرا راستہ روکنا چاہتی ہے یا مجھے بھجانا چاہتی ہے، افسوس صد افسوس، یہ دھوکہ کسی اور کو دنیا میں نے جھکوتین طلاقیں دی ہیں، جس کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر بہت مختصر، زندگی بہت حقیر، اور نیرِ خطہ بہت بڑا ہے، آہ زاد سفر کتنا کم ہے، سفر کتنا طویل ہے، راستہ کتنا وحشتناک ہے!

اب آپ کے سامنے ایک دوسری مثال پیش کی جاتی ہے، یہ ایک صحابی کا خطبہ ہے جو ایک مشہور اسلامی شہر میں دیا گیا ہے۔

خالد بن عمیر العدوی سے روایت ہے کہ عقبہ بن غزو ان نے (جو بصرہ کے امیر تھے) ہمیں خطبہ دیا، حمد و ثنا کے بعد انھوں نے کہا کہ بیشک دنیا اپنے خاتمے کے قریب ہے، اور

لے صفوة الصفوة ابن جوزی۔

بہت تیزی کے ساتھ جگہ چھوڑتی جا رہی ہے اور اس کے جام میں اب صرف چند گھونٹ یا قطرے باقی رہ گئے ہیں اور تم یہاں سے ایک ایسے گھر میں منتقل ہونے والے ہو جس کو کوئی زوال نہیں، پس کچھ خیرے کر یہاں سے واپس جاؤ، اس لئے کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک پتھر جہنم کے کنارہ سے پھینکا جائے گا، تو ستر برس تک اس میں گرتا رہے گا، اور نہ تک نہ پہنچ پائے گا، اور خدا کی قسم وہ بھری جائے گی، کیا تم کو اس میں تعجب ہے؟ اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنت کے دروازے کے دونوں چوکھٹ کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے، اور اس پر ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ آدمیوں سے کھچا کچھ بھری ہوگی، اور بیشک ستر سال کا دن ہم پر اس حالت میں گزر جاتے تھے کہ درخت کے پتوں پر بہاؤ گزر رہا تھا، جس کو کھاتے کھاتے منہ کے کنارے پھل جاتے، مجھے ایک چادر ملی تو میں نے اس کے دو ٹکڑے کئے ایک سعید بن مالک کو دیا، ایک میں نے اوڑھ لیا، آج ہم ہیں سے ہر ایک آدمی کسی بڑے شہر کا امیر و والی ہے، اور میں خدا سے اس کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی نظر میں بڑا ہوں اور خدا کے نزدیک چھوٹا ہوں۔

### جدید ذہنیت اور عقیدہ آخرت کی کمزور تر جانی

جو ذہنیتیں اور جو تحریکیں ایمان سے پوری طرح سیراب نہیں اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس درسگاہ کی تربیت و رہنمائی براہ راست حاصل نہیں وہ اس فکر و عقیدہ یا اس ذوق و رجحان کو پوری طرح ہضم کرنے کے قابل نہیں ہوتیں اور اس سے ان کو زیادہ دیکھی معلوم نہیں ہوتی، وہ برابر اس کے بارہ میں کشمکش میں رہتی ہیں یا اس کے

لے صحیح مسلم ج ۲۔ (کتاب الزہد)



تذکرہ میں ان کے اندر وہ گرم ہوشی نہیں پائی جاتی جو مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والوں میں پائی جانی چاہئے، وہ اس سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتی ہیں یا اس کی بی تاویل کرتی ہیں کہ اس طرح کی باتیں ایک خاص زمانہ اور ماحول کے لئے تھیں، اور ان کے کچھ خاص سبب تھے، لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن مجید اور سیرت نبوی اس رُوح سے لبریز اور متور ہے، اور یہی وہ صحیح اسلامی مزاج یا اسلامی نفسیات ہے جو صرف مدرّسہ نبوت میں پیدا ہوتی ہے، چنانچہ جب بھی قرآن مجید اور سیرت نبوی کو کسی ماحول میں اپنا کام کرنے کا اور کسی ایسی نسل کی تیاری کا موقع ملتا ہے، جو بیرونی اثرات سے محفوظ رہی ہو اور جس کی نشوونما خالص اسلام میں ہوئی ہو تو اس کا خمیر مزاج، ذہنیت یا نفسیات یہی ہوتی ہے، دنیا کی آرائش اور ضرورت سے زائد چیزوں سے پرہیز، قناعت آخرت کی فکر اور ان کاموں سے دلچسپی جو اخروی زندگی میں نفع دے سکیں، خدا کے سامنے حاضری کا شوق جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کو دنیا پر ترجیح دینا، ایمان پر خاتمہ اور خدا کی راہ میں موت کا استقبال، یہ اہل ایمان کی وہ جماعت اور وہ انسانی نمونہ ہے جس کی زبانوں پر اب بھی کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام اور تابعین اولین کا یہ جملہ بے ساختہ آجاتا ہے :-

غَدَا لَاقِي الْاٰخِرَةِ مُحَمَّدًا اَوْ حَزِيْنًا  
کل دوستوں اور محبوبوں سے ملاقات ہوگی

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت ہے!

**نبوت کی دعوت اور اصلاحی تحریکات کا فرق**

بعض تحریکیں اور دعوتیں ایمان بالآخرت کی ترجمانی و تشریح بہت اچھی طرح

لے یہ سیدنا بلال بن رباحؓ کی بحثی کا جملہ ہے (احیاء العلوم روایت ابن ابی الدنیا)

کرتی ہیں، اور بہت تفصیل کے ساتھ اور لنشیں طریقہ پر اس کی حکمتوں، قائموں اور زندگی پر اس کے خوشگوار اثرات اور اخلاقی نظام میں اس کی اہمیت کا ذکر کرتی ہیں، لیکن ہر ذہین و سمجھدار شخص محسوس کر سکتا ہے کہ یہ آخرت کا صرف ایک اخلاقی ضرورت اور ذریعہ اصلاح و تربیت کے طور پر استعمال ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر بہتر سوسائٹی اور صالح معاشرہ کا قیام مشکل ہے، یہ کوشش بعض وجوہ سے لائق تحسین ضرور ہے، لیکن وہ انبیاء کرام کے طریقہ فکر اور طریقہ عمل، ان کی سیرت و کردار اور ان کے خلفاء و نائبین کے طریقہ زندگی سے کھلے طور پر مختلف ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر (یعنی طریقہ انبیاء) ایمان و وجدان، احساس و شعور اور ذوق و شوق کا نام ہے، وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو انسان کے تمام احساسات و جذبات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، آخر الذکر اس کو قانونی حیثیت سے تسلیم کرنے کی ظاہری شکل ہے، اول الذکر لوگ آخرت کا ذکر جب کرتے ہیں، بے ساختگی، لذت اور لطف و کیفیت کے ساتھ کرتے ہیں، اور اس کی دعوت بڑی قوت، گرم جوشی اور یقین کے ساتھ دیتے ہیں، دوسرا طرز رکھنے والے لوگ ایک اخلاقی و سماجی ضرورت کے بقدر اس کا ذکر کرتے ہیں، اور قومی اصلاح اور اخلاقی تنظیم کے جذبہ سے اس کی دعوت دیتے ہیں، جذبہ اور وجدان اور ذوق و کیفیت اور منطق اور اجتماعی مصالح میں جو عظیم فرق ہے، اس کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں۔

### قوت کا سرچشمہ اور بہت و پیچیدگی کا سب سے بڑا محرک

لیکن آخرت پر اس زبردست یقین، دینا پر اس کی ترجیح و فوقیت اور تعیشات اور فضول سامان آرائش سے اس درجہ کنارہ کشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

اصحاب کرام کو دنیا کی قیادت اور انسانیت کی رہنمائی سے دستبردار ہونے اور زندگی کے دھالے سے علیحدہ رہنے پر آمادہ نہیں کیا، اس نے ان کے اندر یہ جذبہ پیدا نہیں کیا کہ وہ اسباب معیشت کو ترک کر دیں اور حق و صداقت کے لئے جدوجہد سے دست کش ہو جائیں، ان کا ایمان کمزوری اور شکست خوردگی کا باعث نہ تھا (جیسا کہ آخری صدیوں میں ہم کو نظر آ رہا ہے) بلکہ وہ قوت کا سرچشمہ اور ہمت و پیشقدمی اور بدی کے خلاف جدوجہد کا بہت بڑا محرک تھا، وہ جاں بازی، دلیری، قوت اور فتح و ظفر کا وسیلہ اور بڑا ذریعہ تھا، چنانچہ جو لوگ دنیا کے معاملہ میں سب سے زیادہ زائد آخرت کے سب سے زیادہ شائق، اس کے یقین میں سب سے زیادہ سرشار اور خدا تعالیٰ کے دربار میں حاضری اور شہادت فی سبیل اللہ کے سب سے زیادہ مشتاق تھے، وہی سب سے زیادہ جاں نثار و جاں باز، بہادر و جگمگا تھے اور حق کے لئے سرفروشی، جہاد و قربانی اور فتوحات اسلامی میں ان ہی کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ یہ دراصل اس عقیدہ کی خاصیت ہے، وہ قدرتی طور پر اپنے ماننے والوں میں اس زندگی کی بے وقتی، خواہشات پر قابو اور مردانگی و حق پرستی کے یہ اوصاف پیدا کرتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی فتوحات و ترقیات اور اس کی عام ترویج و اشاعت اسی ایمان و عقیدہ کی مرہون منت ہے۔

### ایمان بالآخرت اور رہبانیت میں کوئی رشتہ نہیں

اس لحاظ سے یہ عقیدہ (یعنی ایمان بالآخرت اور اس دنیا کی زندگی کے بارہ میں قرآنی نقطہ نظر) اس معنوں و ناپسندیدہ رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جس کی قرآن نے بہت مذمت کی ہے، اور جو عالم اسلام میں اسلامی تعلیمات کی کمزوری و بے اثری

اور قرون اولیٰ سے بُدائیزم، رجمانات اور سیرونی فلسفوں مثلاً مسیحیت، بودھ مت، برہمنزم اور افلاطونیت جدیدہ کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی۔

یہ عقیدہ دنیا کی حق تلفی اور اس کی صحیح قیمت سے انکار کے بغیر آخرت کی ترجیح پر قائم ہے، اس کی بنیاد آخرت کے لئے جدوجہد، حق و صداقت کے لئے سعی مسلسل اور لازوال زندگی کے حصول کے لئے عارضی و فانی خواہشات کی قربانی اور رضائے الہی کی طلب ہے اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان صرف اس عقیدہ کی کمزوری کی وجہ سے کمزور ہوئے ہیں، مسلمانوں کی نئی نسل جو آج ہوا وہوس میں گرفتار نظر آرہی ہے، اس کو اس عقیدہ کی تجدید اس کے از سر نو احیاء اور مسلمانوں میں اس کی اشاعت کی شدید ضرورت ہے، سکی ہوئی چول اس وقت تک اپنی صحیح جگہ پر نہیں آئے گی اور مسلمانوں کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک وہ اس زندگی کو قرآن کی نگاہ سے دیکھنا شروع نہ کریں گے اور یہ وہ نقطہ ہے جس سے مادی طرز فکر کو سخت اختلاف ہے، جو لوگ مادی فلسفہ اور اس زندگی کی پرستش میں مبتلا ہیں خواہشات کے مائے ہوئے اور نفس کے کچلے ہوئے ہیں، اور صرف دنیا کی خوشحالی و ترقی اور آرام و راحت کے طلبکار ہیں، اور اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتے، وہ اس نقطہ نظر کو قبول کرنے یا اس کے ساتھ صلح کر لینے پر کسی صورت میں تیار نہیں ہو سکتے۔

سورہ کہف نے اسی مادہ پرستانہ طرز فکر کی تردید کی ہے، اور اس مادی مذہب اور اس کے علمبرداروں پر ضرب لگائی ہے، اس نے اس زندگی کی صرف وہ تصویر پیش کی ہے جو صحیح اور مطابق حقیقت ہے، خواہ یہ بات کسی کو پسند ہو یا نہ ہو۔

## حضرت موسیٰؑ و حضرت خضرؑ کا قصہ

اب ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا وہ قصہ شروع کرتے ہیں جو اسی زندگی اور

اسی دنیا کا قصہ ہے جس میں ہم سب رہتے ہیں، اس سے بہت علمی طریقہ پر اور بڑی واضح اور غیر معمولی شکل میں بیانات ثابت ہوتی ہے کہ اس دنیا کے معلومات و کشوفات سے ماوراء اور بہت سی نامعلوم چیزیں بھی ہیں اور جن چیزوں سے ایک انسان (خواہ وہ بہت بڑا عالم و باخبر ہو) ناواقف ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں، جو اس کے علم میں ہیں، وہ ہمیشہ اپنے مشاہدہ اور احساس پر رائے قائم کرتا ہے، اور اسی لئے اس سے بار بار غلطیاں ہوتی ہیں، اور ٹھوکریں لگتی ہیں، اگر زندگی کے حقائق اس پر آشکارا ہو جائیں اور رموز و اسرار اور باطنی معاملات کا اسے علم ہو جائے تو اس کے نظریات بڑی حد تک بدل جائیں گے، اور خود اس کو اپنے بہت سے فیصلوں سے ہٹنا پڑے گا، اس قصہ سے ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کی رائے اور فیصلہ مسلک و رجحان اور احساس و خیال کا کوئی بھروسہ نہیں، مزید یہ کہ اس کائنات کا احاطہ ناممکن ہے، اس لئے رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے میں عجلت اور اپنے احساسات و خیالات پر اصرار درست نہیں، یہ زندگی بڑی مبہم، لپیٹی ہوئی، اور تندرست ہے کائنات بڑی وسیع اور عظیم ہے، جگہ جگہ اس کا باطن، ظاہر سے مختلف اور آخر، اول سے جدا ہے، اس زندگی میں اتنے بڑے بڑے معجزے، حیرت انگیز سوالات ہیں کہ انسان اپنی ساری ذہانت، علم، اور جستجو و آرزو کے باوجود ان کو ابھی تک حل نہیں کر سکا، اس میں بکثرت ایسی گہمیں اور گتھیاں ہیں جن کی عقدہ کشائی سے علم انسانی اپنی ساری وسعت اور ترقی کے باوجود عاجز ہے، روزمرہ کی عام زندگی پر نظر ڈالو تو وہ بھی فاش غلطیوں، عاجلانہ فیصلوں، جذباتی اور فوری اقدامات اور جبرست اور سرسری افکار و خیالات سے آلودہ نظر آئے گی، اگر اس وسیع و عظیم کائنات کا انتظام علم انسانی کے حوالہ کر دیا جائے، اور اس کو مکمل آزادی اور مکمل اختیار دے دیا جائے تو وہ پوری دنیا میں فساد برپا کرے گا، اور نسل اور زراعت دونوں کی ہلاکت و بربادی کا باعث ہوگا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

اس کی نگاہ قاصر اور عمل محدود ہے، جلد بازی اس کے خمیر میں داخل اور بے صبری اس کی سرشت میں پیوست ہے۔

اس عظیم اور اہم حقیقت کو ثابت و ظاہر کرنے کے لئے (جو تمام مذاہب اور ایمان باغیب کی بنیاد ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کی اس سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب فرمایا جس کو نہ صرف علم کا بلکہ خیر و صلاح کا بھی بہت بڑا حصہ ملا تھا، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جن کا شمار اولو العزم انبیاء میں ہے، وہ ایک موقع پر نبی اسرائیل کے سامنے تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ان سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے، تو انھوں نے جواب دیا میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جواب کو پسند نہیں فرمایا، اس لئے کہ انھوں نے علم کا انتساب خدا کے بجائے اپنی طرف کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی بھیجی کہ مجمع البحرین (دو سمندر روں کے سنگم) میں ایک بندہ ہے، جو تم سے زیادہ جاننے والا ہے۔

### عجیب و غریب حالات

اب ان کا سفر ایک ایسے آدمی کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخصوص رحمت سے نوازا تھا اور اپنا خاص علم عطا کیا تھا، ان کا علم و فہم حقیقت سے اور ان کی رائے (جس کی تائید ظاہر سے ہوتی تھی) امر واقعی سے تین موقعوں پر متضاد م ہوتی ہے۔

حضرت خضر جس کشتی پر سوار ہوتے ہیں، اور جس پر اس کا مالک ان کو بلا معاوضہ کے سوار کرتا ہے، اسی کو توڑ دیتے ہیں، حضرت موسیٰؑ اس سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے علم اور حال ظاہری کے مطابق اس کا سبب دریافت کرتے ہیں، حضرت خضر ایک معصوم لڑکے کو

لے صحیح بخاری ج ۲ (کتاب التفسیر)

جس نے ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی، نہ اس کے والدین نے ان کے ساتھ کوئی برا معاملہ کیا، قتل کر دیتے ہیں، اسی طرح ایک گرتی ہوئی دیوار کی بلا اجرت مرمت کرتے ہیں حالانکہ گاؤں والے ان کی میزبانی کے لئے بھی تیار نہ ہوئے تھے، حضرت خضرؑ کے وہ عجیب و غریب معاملات اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں تھیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں حد درجہ حیرت و استعجاب پیدا کرتی تھیں، اور ان کو بار بار سوال کرنے پر مجبور کرتی تھیں، جو کشتی ان کے سفر میں مددگار ثابت ہو رہی تھی، اس کا حق یہ تھا کہ اس کی حفاظت کی جائے نہ کہ اس کو توڑا جائے، اسی طرح کشتی کے مالک نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کے اس احسان کا اعتراف کیا جائے، اور اس کے ساتھ خیر خواہی کی جائے، اس محصوم لڑکے کا حق یہ تھا کہ اس کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا جائے اور اس کی تربیت اور نگہداشت کی جائے جس گاؤں والوں نے ان کے ساتھ اس قدر بے مروتی اور تنگ دلی کا ثبوت دیا تھا، ان کو کھانا پانی دینے کے بھی روادار نہ ہوئے تھے، ان کا حق یہ تھا کہ ان کے ساتھ اس بہادر دی کا معاملہ نہ کیا جائے، لیکن حضرت خضرؑ بظاہر معقول بات اور عزت و دستور کے خلاف نظر آتے ہیں، اور ان تینوں موقعوں پر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس کی تائید نہ عقل سے ہوتی ہے، نہ منطق سے، نہ ذوق و وجدان سے، حضرت موسیٰؑ جو اللہ کے نبی اور ایک ایسے انسان تھے، جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ غیور و حساس واقع ہوئے تھے، اور کسی غلط کارروائی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، ان ناقابل فہم باتوں اور کارروائیوں کے سامنے خاموش نہیں رہ پائے، وہ اپنا وعدہ بھول کر اپنی مخالفت اور حیرت کا اظہار آخر کار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں :-

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا شَكْرًا      آپ نے کیسی برائی کی بات کی !

(سورہ کہف - ۷۴)

## حقائق کتنے عجیب ہوتے ہیں

حضرت خضرؑ حضرت موسیٰؑ کے سوالات کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں، اور ان کا جواب دیئے بغیر بڑے صبر و سکون کے ساتھ اپنی کارروائی میں مشغول رہتے ہیں یہاں تک کہ یہ سفر اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر تمام ہوتا ہے اس وقت وہ ان رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں، جو ان واقعات کے اندر پوشیدہ تھے اور حضرت موسیٰؑ کے لئے سخت حیران کن اور ناقابل فہم تھے، جو شخص ایک بار بھی قرآن مجید میں اس قصہ کو پڑھتا ہے اس پر یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت خضرؑ حق پر تھے اور انھوں نے جو کچھ کیا درست کیا، انھوں نے ان تینوں مواقع پر بڑی حکمت و دانائی کا ثبوت دیا، انھوں نے کسی اچھائی کی جگہ برائی اور برائی کی جگہ اچھائی نہیں کی، کشتی توڑ کر انھوں نے یہ احسان کیا کہ اس کو ضبطی سے بچایا، اس کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ وقت کشتیوں کی تلاش میں تھا، اور صحیح سالم کشتی کو غضب کر رہا تھا، انھوں نے بلا معاوضہ سوار ہونے کا معاوضہ یہ دیا کہ اس کی کشتی بادشاہ کی ظالمانہ دستبرد سے بچالی۔

لوٹ کے والدین کے ساتھ ان کا احسان یہ تھا کہ یہ لوگ ان کے لئے فتنہ بننے والا تھا اگر وہ زندہ رہتا تو ان کو سرکشی و کفر تک پہنچا دیتا، انھوں نے سوچا کہ گھڑی بھر کا روزانہ زندگی بھر کے رونے اور مرنے کے بعد رونے سے بہتر ہے، لوٹ کے کا بدل ممکن ہے لیکن ایمان اور حسن خاتمہ کا بدل ممکن نہیں۔

وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ أَبُو الْعَمَّاسِ مِنْ

بَقِي رِوَايَاتِهِ كَمَا سَمِعْتُمْ وَأَسْأَلُكُمْ عَنْ

هَذِهِ الْمَسْأَلَةِ أَنْ يَرْوِيَهَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ

فَارْزُقْنَا أَنْ يُبَيِّنَ لِهَؤُلَاءِ مَا خَبَّرْنَا

مِنْهُ كَلَاؤًا وَاقْرَبَ رَحْمَةً



(سورہ کہف - ۸۱، ۸۰) دینداری میں بھی اور محبت کرنے میں بھی۔

شکستہ اور جھکی ہوئی دیوار اس لئے درست کی کہ وہ دتیم لڑکوں کی ملک میں تھی، اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا، اگر وہ گر جاتی تو خزانہ کا راز کھل جاتا، پورا اچکے اس کو لوٹ لیتے اور تیرہ تیسیم محروم رہ جاتے، ہوا اس کے اصل مالک اور جائز وارث تھے، اس طرح یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ عمل کی پاکیزگی زندگی میں بھی نفع پہنچاتی ہے اور مرنے کے بعد بھی، جب اللہ تعالیٰ ایک صالح مرد کی اولاد کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتا تو خود مرد صالح کو کیوں ضائع کرے گا، اور بے یار و مددگار چھوڑ دے گا:-

وَاللّٰهُ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْحَسَنِيْنَ  
(سورہ یوسف - ۹۰)  
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنَّا لَا ضَیْعَ  
عَمَلٍ عَامِلٍ مِّمَّنْ مِّنْ ذَكَرْ اَوْ اُنْحَاہُ  
جواب میں ان کے رب نے فرمایا میں تم  
میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں  
ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت۔  
(سورہ آل عمران - ۱۹۵)

ہوپاک بیج ڈالے جاتے ہیں، ان کا بھی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اور جو برے ہوتے ہیں، ان کا بھی۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ  
فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا  
وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ اَنْ  
يَّبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَخْرِجَا لَهُمَا مَا  
كَانَ مِنْ رِّبَاكَ وَمَا عَلَّمَهُنَّ امْرِئًا  
ذٰلِكَ تَاْوِيلُ مَا لَمْ يَسْطِعْ عَلَيْهِ  
صَبْرًا  
(سورہ کہف - ۸۲)

”اور وہ دیوار درست کر دی گئی تو اس کا  
معاملہ بھی ایسا ہی ہے وہ شہر کے دو تیسیم  
لڑکوں کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا  
ہوا ہے، ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا پس  
تمہارے پروردگار نے چاہا، دونوں لڑکے  
اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ  
پار نکالیں“ (اگر وہ دیوار گر جاتی تو ان کا

خزانہ محفوظ نہ رہنا اس لئے ضروری ہوا کہ  
اسے مضبوط کر دیا جائے) یہ ان لڑاکوں کے حال  
پر پروردگار کی ایک ہرمانی تھی جو اس طرح  
ظہور میں آئی اور یاد رکھو! میں نے جو کچھ کیا اپنے  
اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا) یہ ہے  
حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکتے!

## علم انسانی کمال اور حقیقت اشیاء تک نہیں پہنچ سکتا

پس پردہ حقیقتیں کتنی عجیب و غریب ہوتی ہیں، صورت و حقیقت اور ظاہر و باطن  
میں کتنا اختلاف ہے! یہ زندگی کتنی پیچیدہ اور اس کی ڈو کتنی اچھی ہوئی ہے! کائنات کتنی مبہم  
اور زندگی کے معنی اور پسلیاں کتنی مشکل ہیں اور انسان اپنے اس دعویٰ میں کس قدر جبری  
و مبیاک ہے کہ اس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے اور ہر مسئلہ کی حقیقت اور ہر مسئلہ پہنچ  
گیا ہے! پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضرؑ حقیقت اور واقعہ سے کتنے دور تھے اور  
ان کا رویہ اعتدال و توازن سے کتنا مختلف تھا! لیکن انجام کار ان کی فہم و رائے کتنی درست  
اور مطابق حقیقت تھی! اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ زندگی رواں دوا  
ہے اس کے پاس ہر زمانہ کے لئے نئے سامان اور نئے عجائبات ہیں! وہ ہر روز اپنے نئے راز  
کھولتی اور نئے اسرار ظاہر کرتی ہے! اس سے یہ بھی آشکارا ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں اور  
اس کا آخری کنارہ ہماری دسترس سے بہت دور ہے:-

وَقَوِّ كُلَّ دِيٍّ عِلْمٍ عَلَيْهِ ۝  
(سورۃ یوسف - ۷۶)

اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والی ہستی ہے

## مادی طرز فکر کو چیلنج

یقیناً اپنے ان مضامین و معانی کے ساتھ جو اس میں وارد ہوئے ہیں، اس مادی فلسفہ کو چیلنج کرتا ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ زندگی بس وہی کچھ ہے جو ہم نے سمجھا ہے اور کائنات کا پورا علم ہم کو حاصل ہے اور حقیقت صرف وہی ہے جو آنکھوں سے نظر آئے، زندگی اور کائنات میں معیار صرف "ظاہر" ہے اور اس پر بے خوف و خطر رائے قائم کی جاسکتی ہے انسان اس کا حقدار ہے کہ اس دنیا کا انتظام اس کے حوالہ کیا جائے، قانون سازی کا حق اس کو حاصل ہو، اس لئے کہ علم عقل اور مطالعہ تحقیق ہر چیز میں وہ کامل ہے اور حقیقت اور علم کی گہرائیوں اور کائنات کی حقیقتوں تک اس کی رسائی ہو چکی ہے۔

تمام مادی فلسفوں کی ہمیشہ ہی بنیاد رہی اور جدید و معاصر تمدن بھی اسی فکر و عقیدہ پر قائم ہے، سورہ کہف (اپنے مضامین و آیات میں) عمومی طور پر اور حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا یہ قصہ خصوصی طور پر اس بنیاد پر پیشہ چلاتا ہے اور اس کو ختم کر دیتا ہے، یہ قصہ حضرت خضر کے ان آخری الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ نَاقُلُ مَالَهُمْ تَسْتَطِيعُ عَلَيْهِمْ صَبْرًا ۖ يٰۤاٰدَمُ اَنْزِلْ اِلٰى هٰذَا ۚ يٰۤاٰدَمُ اَنْزِلْ اِلٰى هٰذَا ۚ يٰۤاٰدَمُ اَنْزِلْ اِلٰى هٰذَا ۚ

(سورہ کہف-۸۲) نہ کر سکے!

تاویل قرآن مجید کی اصطلاح میں حقیقت کو کہتے ہیں محبت، انکار اور غلطی انسان کے مزاج میں ہے لیکن بالآخر حقیقت سامنے آکر اپنی بالادستی اور جہانگیری تسلیم کر دیتی ہے۔

چوتھا قصہ جس پر اس سلسلہ کا اختتام ہے، ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو ایمان و صلاح

لے دیکھے تفسیر سورہ اخلاص از شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ۔

(CYRUS) کہتے آئے ہیں، اور جس کو یہود "خویش" اور عرب مورخین "کیخسرو" کہتے ہیں۔

(بانی ص ۱۰۸) خویش ریزیوں سے حال کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو چنانچہ ابھی باہر برس کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر بکٹریا (BACTRIA) (باختر) تک ایشیائی تمام عظیم الشان ملکیتیں اس کے آگے سرسبز ہو چکی تھیں۔

نخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا (LYDIA) کے بادشاہ کروئیس (CROESUS) سے تھی، لیڈیائے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی اور شمالی حصہ ہے جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا، اور جس کا پایہ تخت سارڈیس (SARDIS) تھا، اس جنگ میں بھی وہ فتیاب ہوا، اب ایشیائے کوچک بحر شام سے لے کر بحر اسود تک اس کے زیر نگین تھا، وہ برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا، قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر رک گئے اس لئے کہ سمندر کی موجوں پر چلنے کے لئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔

جب سائرس سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقیناً بحر ایجیئن (AEGEAN SEA) کے اسی ساحلی نفا پر پہنچا ہوگا جو سمندر کے قریب جو اریں واقع ہے، یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کچھڑ سے پانی گند لاہور ہا ہے اور شام کے وقت اسی میں موج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے، اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے "وَجَدَهَا لَعْرُومًا فِي عَيْنِيٍّ مَّحْضَرًا الْكُهْفِ" (۸۱) اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گندے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

فائق و بزرگوار، قدرتی وسائل اور انسان کے لئے پیدا کردہ طاقتوں کی تسخیر تمام چیزوں کا جامع تھا، اور جس نے مفسد و مکرش فائجن اور ظالم و جاہل بادشاہوں کے برخلاف ان مسائل کا استعمال صرف انسانی فلاح، انسانیت کی خدمت اور صالح تہذیب کے قیام کے لئے کیا۔

## ذوالقرنین اور آہنی پشتہ کی تعمیر

ذوالقرنین کی شخصیت میں مفسرین کا اختلاف ہے، مشہور قول یہ ہے کہ وہ سکندر مقدونی تھے، امام رازی بھی اسی رائے کے مؤید اور داعی تھے اور عام علماء اسلام کا رجحان بھی زیادہ تیزی رہا لیکن درحقیقت اس قول کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی قوی دلیل یا محرک موجود نہیں اس لئے کہ سکندر مقدونی میں وہ صفات بالکل نہیں پائے جاتے جن کا ذکر قرآن مجید میں ذوالقرنین کے لئے آیا ہے مثلاً ایمان باللہ، خوف خدا، عدل اور مفتوحہ آبادیوں کے ساتھ رحم و انصاف کا برتاؤ اور اس عظیم پشتہ کا غیر معمولی کارنامہ، یہ خیال غالباً صرف اسکندر مقدونی کی تاریخ اور اس کی جنگی مہمات سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔

بعض معاصر فضلاء و اہل علم کی رائے یہ ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس کو اہل یونان

لے خاص طور پر یونانا بالوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کی جلد دوم میں شکر پرست سے روشنی ڈالی ہے اور تاریخ کے بیانات اور یہودی مذہبی کتابوں کے حوالہ سے اپنا نقطہ نظر ثابت کیا ہے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

۵۹۰ قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت (سائرس) غیر معمولی حالات کے اندر باجھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں پہلے ایران کی سلطنت دو ملکوں میں بٹی ہوئی تھی جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا، اور شمال مغربی میدیا (یہ وہ ہے جس کو عرب مورخ "مابات" کے نام سے یاد کرتے ہیں) اس کی کوششوں سے دونوں ملکوں نے مل کر ایک عظیم شہنشاہی کو تشکیل دیا، پھر اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، وہ فتوحات نہیں، جو ظلم و فحش (باقی صفحہ ۱۰۹)

لیکن ہماری نظر میں سب سے زیادہ صحیح رائے یہ قطب کی ہے مناسب ہے کہ اس موقع پر ان کی پوری عبارت نقل کر دی جائے، وہ "فی ظلال القرآن" میں لکھتے ہیں:-  
 "نص سے ذوالقرنین کی شخصیت اور ان کے مقام اور عہد کا کوئی علم نہیں ہو پاتا قرآنی قصوں کا یہ عام اسلوب و رفاص پہچان ہے تاریخی انضباط اس کا مقصود نہیں مقصود صرف قصے پیدا ہونے والی عبرت ہے اور یہ بات اکثر اوقات ان مکان کے تعین کے بغیر حاصل ہو جاتی ہے۔  
 ہماری مدقن تاریخ میں ایک شخصیت کا نام ضرور آتا ہے جس کو سکندر ذوالقرنین کہا گیا ہے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ قرآن مجید کا ذوالقرنین ہرگز نہیں اس لئے کہ یہ یونانی سکندر مشرک بت پرست تھا، اور قرآن میں جن کا ذکر ہے وہ مومن ہو چھتر شہر اور یوم آخرت کا مال تھے۔

(باقی صفحہ ۱۱۱) ربط لسان میں اور اس طرح اس نے ان پٹکویوں کو پوری کر دیا جو اس کے سلسلہ میں تورات میں آئی تھیں۔

تیسری شکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں باجوج باجوج کے حلے ہو کرتے تھے اس میں وہ بحر خزر (کاسپین) (CASPIAN SEA) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (CAUCASUS) کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا، اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا، جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا، اسی راہ سے باجوج باجوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے اور یہیں اس نے سد تعمیر کیا۔

سائرس کی وفات بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں ہوئی، ۵۳۸ قبل مسیح (PASARGADAE)

(CYRUS) کہتے آئے ہیں، اور جس کو یہود ”خووس“ اور عرب ”خوسرو“ کہتے ہیں۔

(باقی ص ۱۱۰) خوون ریزیوں سے حاصل کی جاتی تھیں بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ نظام قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو چنانچہ ابھی بابہ برس کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر کبٹریا (BACTRIA) (باختر) تک ایشیائی تمام عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سرسجود ہو چکی تھیں۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا (LYDIA) کے بادشاہ کروئیس (CROESUS) سے تھی، لیڈیائے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی اور شمالی حصہ ہے جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا، اور جس کا پایہ تخت سارڈیس (SARDIS) تھا، اس جنگ میں بھی وہ فتیاب ہوا، اب ایشیائے کوچک بحر شام سے لے کر بحر اسود تک کے زیر نگین تھا، وہ برابر بڑھتا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا، قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر رک گئے اس لئے کہ سمندر کی موجوں پر چلنے کے لئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔

جب سائرس سارڈیس کی تہذیب کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقیناً بحر ایجین (AEGEAN SEA) کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہوگا جو بحر ملکہ کے قرب حواریں واقع ہے یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کچھڑ سے پانی گند لاہور ہا ہے اور شام کے وقت اسی میں موج ڈو بتا دکھائی دیتا ہے اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ”وَجَدَهَا عَرَوِي فِي عَيْنِي حَمِيَّةً“ (کہتے ہیں) اے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گندے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی، اس پیش قدمی میں وہ کمران اور بلخ تک پہنچ گیا، اور ان وحشی اقوام پر فتح حاصل کی جو تہذیب و تمدن سے بیکار تھیں، ٹیہیک ٹیہیک قرآن کے اسی اشارہ کی تصدیق ہے ”وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَى حَوْمٍ لَّمْ يَجْعَلْ لَهُمْ مَرْجًا سِتْرًا“ (کہتے ہیں) (اے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی، یعنی فائدہ بخش قبائل تھے، اس کے بعد اس نے بابل جیسے مضبوط دارالسلطنت پر حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو ”نجات“ کے نظام سے نجات دلائی، اس طرح اس کو بنی اسرائیل کا نجات دہندہ کہا جاسکتا ہے، یہود بھی اس کی تعریف میں (باقی ص ۱۱۰ پر)

لیکن ہماری نظر میں سب سے زیادہ صحیح رائے یہ قطب کی ہے، مناسب ہے کہ اس موقع پر ان کی پوری عبارت نقل کر دی جائے، وہ ”فی ظلال القرآن“ میں لکھتے ہیں :-  
 ”نص سے ذوالقرنین کی شخصیت اور ان کے مقام اور عہد کا کوئی علم نہیں ہو پاتا قرآنی قصوں کا یہ عام اسلوب و خاص پہچان ہے، تاریخی انصاف اس کا مقصود نہیں مقصود صرف قصے پیدا ہونے والی عبرت ہے، اور یہ بات اکثر اوقات ان مکان کے تعین کے بغیر حاصل ہو جاتی ہے۔  
 ہماری مدون تاریخ میں ایک شخصیت کا نام ضرور آتا ہے جس کو سکند ذوالقرنین کہا گیا ہے، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ قرآن مجید کا ذوالقرنین ہرگز نہیں اس لئے کہ یہ یونانی سکندر نہ ترک بت پرست تھا، اور قرآن میں جتنا ذکر ہے وہ یونان ہو نہ ہندوستان اور یوم آخرت کا قائل تھے۔

(باقی صفحہ ۱۰۹ کا) رطب لسان ہیں اور اس طرح اس نے ان پٹیوں کو پوری کر دیا جو اس کے سلسلہ میں تورت میں ملی تھیں۔  
 تیسری شکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یا جوج یا جوج کے حلقے ہو کر تے تھے، اس میں وہ بحر خند (کاسپین) (CASPIAN SEA) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (CAUCASUS) کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا، اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا، جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا، اسی راہ سے یا جوج یا جوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے، اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔

سائرس کی وفات بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں ہوئی، ۵۳۸ قبل مسیح (PASARGADAE) کے کھنڈر میں سنگ مرمر کا ایک مجسمہ دریافت ہوا جس کے سر پرینڈھے کی طرح دو سنگیں تھیں جو میڈیا اور پارسی کی ان دو مملکتوں کا رمز تھیں جن کو سائرس نے متحد اور زیر نگین کیا تھا، اور جس کی وجہ سے اس کا نام ”ذوالقرنین“ پڑا، جدید مؤرخین نے سائرس کی حوصلہ مندی اور اس کی انصاف پرورش شخصیت اور کریمانہ اوصاف کی بڑی تعریف کی ہے اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لئے پروفیسر (B. GRUNDI) کا مقالہ مفید ثابت ہوگا۔ دیکھئے

ابو الریحان بیرونی اپنی کتاب "الآثار الباقیة عن القرون الخالیة" میں لکھتے ہیں کہ "قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ حمیر سے تعلق رکھتے تھے اس کا علم ان کے نام کی ترکیب سے ہوتا ہے اس لئے کہ حمیر کے سلاطین اپنے القاب میں "ذو" ضرور لگاتے تھے مثلاً ذوالواس ذوزینر ان کا نام البکر بن افریقش تھا، انھوں نے مجروح کے ساحل تک فوج کشی کی، تونس مراکش اور دوسرے ممالک سے بھی گزے انھوں نے افریقیہ کے نام سے شہر آباد کیا تھا جو بعد میں پورے براعظم کا نام ہو گیا، ان کو ذوالقرنین اس لئے کہا گیا کہ وہ سورج کے دونوں کناروں تک پہنچ گئے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ قول صحیح ہو، لیکن آج اس کے جانچنے کے لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں اس لئے کہ حقیقی تاریخ اب تک لکھی جا چکی ہے اس میں ذوالقرنین کی تلاش بے سود ہے ان کی جو ریت اور حالات زندگی قرآن نے بیان کئے ہیں اس کا حال بھی ان احوال کی طرح ہے جو قرآن مجید نے قوم لوح، قوم ہود، قوم صالح وغیرہ کے سلسلے میں بیان کئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی عمر انسانیت کی عمر کے مقابل میں بہت کم ہے، قریب تاریخ سے پہلے کثرت واقعات گزر چکے ہیں جن کا علم تاریخ کو بالکل نہیں اس لئے اس سلسلہ میں اس کا فتویٰ بالکل معتبر نہیں۔

توریت اگر تخریفات اور اضافات سے محفوظ رہتی تو وہ البتہ اس طرح کے بعض واقعات کے لئے سند بن سکتی تھی لیکن اس میں ایسی کہانیاں شامل کر دی گئی ہیں جن کی افسانویت میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا، اس میں کثرت روایات بڑھائی گئی ہیں اور وحی الہی کا حصہ اس میں خلط ملط ہو گیا ہے اس لحاظ سے توریت بھی تاریخی واقعات میں کوئی یقینی مرجع باقی نہیں رہی۔

اب صرف قرآن باقی رہا جو تخریفات اور تغیرات سے محفوظ ہے وہ ان تاریخی قصوں کی

واحد رند اور سرختم ہے جو اس میں وارد ہوئے ہیں اور بدیہی طور پر قرآن کا محاکمہ تاریخ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، اس کے دو سبب ہیں پہلی بات یہ ہے کہ تاریخ نئی پیداوار ہے تاریخ انسانی کے بے شمار واقعات اس کے علم میں نہیں دوسری طرف قرآن ان سبب واقعات سے پردہ اٹھاتا ہے جس کا ذکر تاریخ کے ریکارڈ میں نہیں ملتا۔

دوسری بات یہ کہ تاریخ (خواہ اس میں ان واقعات کا ذکر موجود ہو) بہر حال ایک بشری عمل ہے اور انسانی اعمال میں خطا و تحریف اور کوتاہ نظری کی جو آلودگی پائی جاتی ہے وہ قدرتی طور پر اس میں بھی ہے ہم اپنے موجودہ زمانہ میں (جس میں مواصلات و ملاقات کے وسائل اور تحقیق و تفتیش کے ذرائع سہولت کے ساتھ میسر ہیں) یہ دیکھتے ہیں کہ ان سہولتوں کے باوجود ایک خبر اور ایک اقتوہ مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے اس کی متضاد تشریحیں کی جاتی ہیں اور مختلف نتائج نکالے جاتے ہیں یہ حقیقی ملمبہ ہے جس سے تاریخ تیار کی جاتی ہے، خواہ اس کے بعد اس کو بحث و نظر اور جانچنے پر کھنے کا اعلیٰ معیار تسلیم کر لیا جائے۔

اس لئے محض یہ کہنا کہ قرآنی قصوں کے بارہ میں تاریخ کا فتویٰ جانتا ضروری ہے ان قواعد علی اور اصول موضوعہ کے بھی خلاف ہے جس پر انسانوں کا عام اتفاق ہے علاوہ اس کے کہ یہ بات اس عقیدہ کے بھی سرسرخلاف ہے جو قرآن کی بات کو فیصلہ کن مانتا ہے اس کو نہ قرآن پر ایمان لانے والا تسلیم کر سکتا ہے نہ بحث علمی کے ذرائع پر بھروسہ رکھنے والا اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ صرف اندازوں، قیاسات اور خیالات کی ہے۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے بارہ میں سوال کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل کی جس میں ان کی سیرت پر کچھ واضح اشارے موجود ہیں



چونکہ قرآن مجید ہی اس کا واحد سرچشمہ ہے اس لئے بغیر علم و تحقیق کے اس میں توسل کی کوشش ہمارے بس سے باہر ہے تفسیر کی کتابوں میں بہتے اقوال آئے ہیں لیکن ان پر یقین کے ساتھ اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس میں سے اگر کچھ لینا ہے تو احتیاطاً کوئی نظر رکھنا چاہئے اس لئے کہ اسرائیلیات اور روایات بھی اس میں شامل ہو گئی ہیں!

### صالح اور مصلح بادشاہ

بہر حال ہم کو معین طور پر کسی ایسی شخصیت کا پتہ لگے یا نہ لگے جس کو ہم ذوالقرنین کہہ سکتے ہیں، اور اس پر وہ ساری تفصیلات منطبق کر سکتے ہیں جو قرآن میں آئی ہیں اور وہ ناقص اور ادھوری تاریخ ہماری رہنمائی کرے یا نہ کرے جو بہت آخر میں مرتب ہونا شروع ہوئی اور جس پر قطعیت کے ساتھ کوئی رائے قائم کرنا بہت دشوار ہے اس سے قرآن کے طالب علم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس لئے کہ ان کے سب ضروری اوصاف ہمارے سامنے ہیں، ان کو اگر اللہ تعالیٰ نے طاقت، ذرائع و وسائل، علو بہت، حوصلہ بندی اور عالی ظرفی عطا کی تھی۔

اَتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا فَاتَّبَعِ  
سَبَبًا (سورۃ کہف - ۸۴، ۸۵)  
نیز اس کے لئے ہر طرح کا ساز و سامان ہیسا  
کر دیا تھا تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک  
(ہم کے لئے) ساز و سامان کیا۔

ان کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا، اور ایک طرف مشرق کے آخری کنارے اور دوسری طرف مغرب کے انتہائی سرے تک پہنچ گیا تھا جس کو قرآن مجید میں مطلع الشمس اور مغرب الشمس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اپنی ان ساری فتوحات اور کارناموں میں ہمیشہ صلح و مصلح،

لے فی ظلال القرآن حصہ ششم طبع پنجم ۱۹۹۱ء از سید قطب

حق کے حامی مضیعفوں کے منس و منحور، سرکشوں اور ظالموں کے لئے تازیانہِ عبرت ہے۔  
ان کا اصول اور پروگرام ہمیشہ وہ رہا جو قرآن نے ان کی زبان سے بیان کیا ہے:-

قَالَ اَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ  
ثُمَّ يَرْدُّهُ اِلٰی رَبِّهِمْ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا  
نَّكَرًا ۗ وَ اَمَّا مَن اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا  
فَلَهٗ جَزَاؤٌ اِلٰی الْحُسْنٰی ۚ وَ سَقَوٰى لَّہٗ  
مِنْ اَمْرِہٖ اٰیٰتُہٗا (سورۃ کہف - ۸۷-۸۸)

ذوالقرنین نے کہا: ہم نا انصافی کرنے والے  
نہیں جو سرکشی کریگا اسے ضرور سزا دیں گے  
پھر اسے اپنے پروگرام کی طرف لوٹنا ہے وہ  
(بد اعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور  
جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کریگا تو اس کے  
بدلے اسے بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں

کا حکم دیں گے جس میں اس کے لئے آسانی درج ہو۔

اس اصول میں جو پاکیزگی و صداقت اس پروگرام میں جو کمال و اعتدال اور اس کی برکٹ  
میں جو اخلاقی بلندی اور حسن سیرت نمایاں ہے اس کی تشریح و توضیح کی چند اہم ضرورت نہیں۔  
اپنی ان پیش قدمیوں اور فووضات کے زمانہ میں ان کا گزرا ایک ایسی قوم پر ہوا جو پہاڑوں کے  
درمیان آباد تھی، اور ہمیشہ خطرات میں گرفتار اور اندیشوں کا شکار تھی، اور ایک وحشی اور جنگلی قوم  
(جو پہاڑ کی اوٹ میں تھی) کے حلوں کا نشانہ بنتی تھی، قرآن اور دوسرے صحفِ سماوی میں اس  
قوم کو یا بوجہ یا بوجہ کہا گیا ہے۔

لہٰذا اس مسئلے میں یہ قطب ہے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہم کو پورا اتفاق ہے وہ کہتے ہیں:-

”ہم قطعیت کے ساتھ اس جگہ کا تعین نہیں کر سکتے جہاں دو دروں کے درمیان ذوالقرنین  
کا گزر ہوا تھا، نہ وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دو قریے کیا تھے اور کیسے تھے؟ نقص سے جو کچھ  
معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی وادی یا گدڑ گاہ میں پہنچے جو طوبی یا مصنوعی دروں  
(باقی صفحہ ۱۱۵ پر)

یہ قوم باہم دست و گریباں اور خانہ جنگی کا شکار تھی اور اس کے افراد ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے :-

وَتَوَكَّلْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
وَمِنْهُمْ مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْهُمْ لُغْمًا وَآخَرًا  
بَعْضُهُمْ يَمُوتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (سورہ کہف - ۹۹)  
(سند کی وجوہ کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔

انہوں نے محسوس کیا کہ یہ موقع بہت قیمتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک طاقتور اور صالح بادشاہ کا پردہ غیب سے انتظام کر دیا ہے، انہوں نے ان سے درخواست کی کہ ان وحشی انسانوں، ظالموں، اور فساد یوں سے حفاظت کی کوئی صورت کر دیں اور اپنے عظیم وسائل و کثیر فوج کے ذریعہ کوئی ایسا پشتہ اور دیوار بنادیں جو یا جوج یا جوج کا راستہ روک دے، انہوں نے

(باقی ص ۱۱۶ کا) درمیان واقع تھی، اور جس میں کوئی پس ماندہ اور کمزور قوم رہتی تھی، لایکا دُونَ يَمُوتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (۹۳)  
جوان کی بات بھی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتے تھے۔“ (ج ۱۳ ص ۱۳)

جہاں تک یا جوج یا جوج کا تعلق ہے، ان کی قومیت و وطنیت کے تعین اور ان کے زمانہ، مروج اور پشتہ کی تباہی و بربادی کا مسئلہ ہے، اس کی بحث بہت طویل ہے اور وہ تفسیر کی کتابوں اور احادیث میں قرب قیام کی علامات اور لڑائیوں کے تذکرہ کے باب میں مذکور ہے لیکن بالکل صحیح تعین اور جزم کے ساتھ کسی تجربہ پرست و آسان نہیں اس لئے اس سلسلہ میں تقدیرین و متاخرین نے جو کلام کیا ہے (اگرچہ اس کی مقدار و تعداد بھی زیادہ نہیں) اس کی طرے رجوع کرنا چاہئے تاہم احادیث کا وہ حصہ جو فتن و ملاحم اور قرب قیامت کی تفصیلات و واقعات سے متعلق ہے، کسی ایسے عالی ہمت، علوم و دینیہ کے جوہر شناس اور تاریخ کے ماہر شخص کا اب بھی منظر ہے جو صبر آزمائش و جستجو و تحقیق و مطالعہ سے کام لے کر اس پر غور کرے، مخلص اور صحیح العقیدہ ہو، اس لئے کہ یہ موضوع بہت اہم، دقیق اور وسیع ہے اور بہت احتیاط اور کاوش کا محتاج ہے۔

اس کے لئے پیشکش بھی کی کہ مالی طور پر وہ اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔

اس صالح مرد نے ان کی یہ درخواست قبول کی، ان سے اس پیشہ کی تعمیر کا وعدہ کیا، لیکن بہت سے لاپچی اور حریص بادشاہوں اور حکمرانوں کے برعکس ان کی مالی مدد قبول نہیں کی، بلکہ جو کچھ اللہ نے ان کو دے رکھا تھا، اسی کو صرف کیا، انھوں نے یہ کہا کہ اپنے زور بازو کے ذریعہ نیز وہاں جو فولاد پایا جاتا ہے اس کے ذریعہ وہ مدد کریں :-

قَالَ مَا مَلَكَنِي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي  
بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا  
الْوَلِيُّ رَبَّنَا الْحَدِيدُ  
(سورہ کہف - ۹۵-۹۶)

اور یا جو جہاں جو جہاں کے درمیان ایک مضبوط  
دیوار کھڑی کر دوں گا (اس کے بعد اس نے حکم  
دیا) "لوہے کی سلیں میرے لئے بھیا کر دو"

سنجے کل اس مبارک و کار آمد پیشہ کی تعمیر میں حصہ یا ایک طرف اس صالح سلطان کی  
حکمت و صناعی تھی، دوسری طرف محنت و مزدوری اور ضروری سامان یعنی فولاد تھا :-

حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ  
قَالَ انْقُضَا هَٰذَا حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا  
قَالَ الْوَلِيُّ أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا  
(سورہ کہف - ۹۶)

پھر جب (تمام سامان بھیا ہو گیا اور) دونوں  
پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بنا  
کر دی تو حکم دیا "بھینساں لگاؤ اور اسے دھونکو"  
پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل لگ لگائی  
طرح لال ہو گئی تو کہہ لگا ہونا بنا لال اس پر  
انڈیل دیں

بالآخر یہ شہنشاہ بن کر تیار ہوا، اور اس کی وجہ سے ساری قوم ان دونوں پہاڑوں کے پیچھے بنے والے دشمنوں سے محفوظ ہو گئی۔

فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا  
چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سببن گئی کہ  
(یا جوج اور ابوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے  
تھے نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے! (سورہ کہف - ۹۷)

### حکیم و دانامومن کی بصیرت اور دینی سمجھ

یہ وہ موقع ہے جہاں اس طاقتور بادشاہ کے دل میں جو قوموں کا فاتح اور جہاگیر و جہاں کشا تھا، ایمان نے جوش مارا، نہ ان کے دل میں خود پسندی کی کوئی ہر سید ہوئی نہ غفلت یا تکبر کا سایہ ان پر پڑ سکا، انھوں نے نہیں کہا کہ اِنَّا اُنْتَبِیْنا عَلٰی عِبَادِ جِبْرِیْلٍ بلکہ اس سب کا انتساب انھوں نے اللہ کی طرف کیا اور اس دھوکہ میں نہیں پڑے کہ ان کا یہ کارنامہ لافانی اور بیشیہ ناقابلِ تسخیر ہے، انھوں نے ایک صاحبِ بصیرت اور صاحبِ فراست مومن کی طرح جو آخرت یقین رکھتا ہے اور انسانی کمزوری و ناتوانی اور زمانہ کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہے، صرف یہ کہا ہے۔

قَالَ هَذَا رَحْمَةٌ مِنْ رَبِّيْ فَادْخُلْهَا  
وَعُدُّ رَبِّيْ جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ  
دَحْدُرُ رَبِّيْ حَقًّا  
ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا یہ  
(جو کچھ ہوا تو فی الحقیقت) میرے پروردگار  
کی ہر بات ہے، جب میرے پروردگار کی فرمائی  
ہوئی بات ظہور میں آئیگی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ  
ریزہ کر دے گا (مگر اس سے پہلے کوئی اسے

(سورہ کہف - ۹۸)

لے یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔ (تقص - ۷۰)

ڈھانہیں سکتا اور میرے پروردگار کی

فرمانی ہوئی بات سچ ہے، ملنے والی نہیں۔“

یہ اس با اقتدار و با خبر انسان کا کردار ہے، جو قطعی طاقتوں اور مادی وسائل کو سخر کر لیتا ہے اور اسباب ذرائع کی زمام اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے اس کی فتوحات اور کارناموں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے لیکن اپنی مادی قوت اور اقتدار و سلطنت کے انتہائی عروج اور وسعت کے موقع پر بھی وہ اپنے رب کو نہیں بھولتا، اس کے سامنے اس کا سر ہمیشہ خم اور گردن جھکی رہتی ہے آخرت اس کے مد نظر ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ ہر وقت کوشاں اور لرزاں و ترساں رہتا ہے، اپنے ضعف و ناتوانی کا اقرار کرتا ہے انسانیت اور کمزور اقوام کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتا ہے، حق کی حمایت کرتا ہے، اور اپنی ساری قوت و صلاحیت، سعی و جدوجہد اور ذرائع و وسائل انسانیت کی خدمت، صالح سوسائٹی کی تعمیر، اعلاء کلمۃ اللہ اور انسانوں کو اندھیروں سے روشنی میں لانے اور مادیت کی بندگی سے خدا کی بندگی میں داخل کرنے پر صرف کرتا ہے، یہ وہ کردار ہے جس کی نمائندگی سلیمان بن داؤد علیہ السلام اپنے عہد میں، ذوالقرنین اپنے زمانہ میں، خلفاء راشدین اپنے دور میں اور ائمہ اسلام مختلف زمانوں اور ملکوں میں برابر کرتے رہے۔

## خالق کائنات سے بغاوت مغربی تہذیب کا مزاج ہے

تاریخ کے چند افسوسناک سانحوں میں ایک لٹاک سانحہ اور انسانیت کی ایک بڑی فتنہ بستی یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئی، اور پروان چڑھی جس میں دین سے بغاوت اور ایمان بالغیب کا انکار عام ہو چکا تھا، یہ ایک ایسی قوم کے درمیان پیدا ہوئی جو ان تمام لوگوں کے باطنی تھی، جو دین کے دعوے دار بن کر اس کو اپنی نفسانی خواہشات، انانیت اور مفاہات کی تکمیل

کے لئے استعمال کر رہے تھے ان کی غلط کرداری، تعصب، وحشت، ترقی سے نفرت اور عقل اور علم کی راہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے وہ ان سے حد درجہ سبزا اور متنفر تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدن و صنعت کا نشوونما اور زندگی کی نئی تنظیم خالص مادی بنیادوں پر ہونے لگی، معاشرہ اور انسانی افراد کا تعلق ان کے پیدا کرنے والے اور کائنات کے خالق و مالک سے ٹوٹ گیا، یہ سب ایک سلسلہ اسباب کا نتیجہ تھا جس میں مزاج، اقتاد طبع، حالات کا تقاضہ اور یورپ کے مخصوص نظام زندگی سب کو دخل ہے اس تہذیب کا ارتقا اور نشوونما اس کا اور اخلاقی فساد کے ساتھ ہوا، دوسری طرف اسباب ذرائع کی تسخیر صنعتی ترقی، اور طبعی علوم میں وہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی، فاصلے اور مسافتیں معدوم ہو گئیں اور انسان کرۂ ہوائی سے پار ہو گیا اور آخر میں اس نے چاند پر بھی اپنا قدم رکھ دیا، اس کے علاوہ طبیعیات و فلکیات کے میدان میں بکثرت دوسری فتوحات اس نے حاصل کیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی مادی طاقت طبعی قوتوں کی تسخیر، کائنات پر اقتدار، کفر اور مادہ پرستی کے ساتھ بالکل گھل مل گیا ہے، اور مغربی تہذیب کی مخصوص علامت اس کی امتیازی خصوصیت اور نمایاں پہچان بن گئی ہے، ہم کو کسی ایسی تہذیب اور تمدن کا علم نہیں جو اس درجہ مادی قوت رکھنے کے ساتھ مذہب، اخلاق سے اس درجہ برسرِ جنگ خالق کا تقاضا اور اس کے بنائی ہوئی شریعت اور دستور و قانون کا اس طرح باغی و منکر اور مادیت کی پرستش، نفس کی غلامی اور بلبوبیت کے دعویٰ میں اس طرح مبتلا ہو جس طرح یہ مغربی تہذیب۔

### مادی تمدن کا نقطہ اختتام

ہم نے ابھی ذکر کیا کہ مغربی تہذیب کا نشوونما اس طرح ہوا ہے کہ کائنات کا اقتدار

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" (فصل اول باب چہارم)

اس کو حاصل ہے، لیکن وہ خدا کی منکر اور عادت کی اسیر بھی ہے، اس کے ذمہ دار اور نمائندے اپنی قوت اور صنعت کے سوا اور کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے اور اپنی مصلحت اور غرض کے سوا کسی اور چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، اس کے بڑے مراکز — امریکہ، یورپ اور روس — کبھی اعلان کے ساتھ اور کبھی بغیر اعلان کے غلبی حقائق، روحانیت، اخلاق، اور آسمانی نظام سے متقل بہرہ ریکار ہیں اور حالت جنگ میں ہیں اور اب وہ زمانہ قریب ہے کہ جب یہ تہذیب، مادیت اور صنعتی ترقی نقطۂ اختتام پر پہنچ جائے گی اور اس کا وہ سب سے بڑا نمائندہ اور ذمہ دار ظاہر ہوگا جس کو نبوت کی زبان میں دجال کہا گیا ہے، اور جو ایک طرف مادی اور صنعتی عروج اور دوسری طرف کفر، مادیت و اتحاد کی

لہ جن احادیث میں دجال کا ذکر آیا ہے اور اس کے اوصاف و علامات بیان کئے گئے ہیں وہ تو انہی سنوی کی حد تک پہنچ چکی ہیں ان میں خاص اس کی صراحت ہے کہ وہ ایک متین شخص ہوگا جس کے کچھ معین صفا ہوں گے وہ ایک خاص اور عین زمانہ میں ظاہر ہوگا جس کی صحیح تاریخ اور وقت سے ہم کو آگاہ نہیں کیا گیا ہے نیز ایک میں قوم میں ظاہر ہوگا جو یہود ہیں اس لئے ان نام و مضامین کی موجودگی میں نہ اس کے انکار کی گنجائش ہے نہ ضرورت احادیث میں اس کا بھی تعین کر دیا گیا ہے کہ وہ فلسطین میں ظاہر ہوگا، اور وہاں اس کو عروج و غلبہ حاصل ہوگا، حقیقت فلسطین وہ آخری ایسٹج ہے جہاں ایمان و ادیت اور حق و باطل کی کشمکش جاری ہے، اور نظر عام پر آنے والی ہے، ایک طرف اخلاقی اور قانونی حقوق رکھنے والی قوم ہے جن کا سب سے بڑا ہتھیار اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دین اور دعوت الی اللہ کے حامل ہیں اور انسانیت کی فلاح اور مسافہ کے داعی ہیں دوسری طرف وہ قوم ہے جو ایک خاص نسل اور خون کے تقدس پر برتری کی قائل ہے، اور پورے عالم اور انسانیت کے سامنے مسائل کو اس نسل اور عصر کے اقتدار و ریاست کے اندر لے آنا چاہتی ہے، اور فنی صلاحیتوں اور علوم طبعیہ کے وسائل و ذرائع کا بہت بڑا ذخیرہ اس کو حاصل ہے، انسانیت کے اس حقیقی اور فیصلہ کن مرکز کے آثار شرق عربی اور شرق اسلامی کے افق پر اب ظاہر ہو چکے ہیں اور حالات و واقعات وہ مناسب فضا اور ماحول تیار کر رہے ہیں جس میں یہ کہانی اپنے سچے کرداروں کے ساتھ دہرائی جائے گی۔



اور جو کچھ گزرا ہے، وہ سب اس مادی صنعتی اوشنی تہذیب کی تصویر ہے، جو بالآخر اپنی انتہا کو پہنچنے والی ہے، اور جس کا جھنڈا آخر میں دجال کے ہاتھ میں ہوگا لیکن صرف یہی بات اس کو دجال بنانے کے لئے کافی نہیں، انسان موت نے اس کی جس تفصیل، تاکید اور اہتمام کے ساتھ مذمت کی ہے، اس کے فتنہ اور ابتلا جسے جس طرح ڈرایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات اس سے زیادہ اہم ہے، اسباب و مسائل اور وقت مادی حضرت سلیمانؑ کو بھی حاصل تھی اور ذوالقرنین کو بھی، اور قرآن مجید نے دونوں کی طاقت، ذرائع و وسائل کی تسخیر، نیز سرعت و تیز رفتاری کا ذکر کیا ہے، اس لئے ہمیں سوچنا چاہئے کہ وہ خطہ فاصل کیا ہے، جو ان کو دجال سے علیحدہ کر لے، وہ کون سی نازک لائن ہے، جو ایک صالح و پاکباز اور باخبر و اختیار و شاہد و فرقہ کرتی ہے، جس کی تعریف قرآن مجید میں یہی ہے،

(سورہ ص ۳۰) رجوع کرنے والا ہے۔

اور ایک فتنہ انگیز اور عالم آشوب شخصیت میں امتیاز پیدا کرتی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار متنبہ کیا ہے اپنی امت کو بار بار اس سے ڈرایا ہے اور بہت اہتمام کے ساتھ اس کی تشریح و وضاحت اور تاکید کی ہے۔

یہ حد فاصل اور سرحدی خطیہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ اور ذوالقرنینؑ نیز اسلام کی ابتداء

صدیوں میں اس طرح کے جتنے نمونے انفرادی یا اجتماعی شکل میں سامنے آئے (ان کے اندر فائق قوت، ملکی وسعت و استحکام، غیر معمولی اور حیرت انگیز حکمت و فراست بہترین اور اعلیٰ مقاصد، دعوت الی الشرا اور اپنے علم و حکمت اور قوت و صلاحیت کو ہدایت، اپنی نوع انسان کی فلاح، اور عدل و انصاف کے لئے استعمال کرنے کی خواہش اور صلاحیت کا بہترین اجتماع تھا) الشرا نے ان لوگوں کے اوصاف اس طرح بیان فرمائے ہیں:-

الَّذِينَ اِنْ مَلَكَتْهُمْ فِي الدُّوْنِ  
اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ  
وَاَمْرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ  
وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِهِ  
(سورہ حج - ۴۱)

یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے  
زمین میں انھیں صاحب اقتدار کر دیا،  
(یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز کا (نظم)  
قائم کریں گے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم  
ہوں گے، نیکوں کا حکم دیں گے، برائیوں  
روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار -  
الشرا ہی کے ہاتھ ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا  
لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فَهُمْ يَخْلَوْنَ  
اِلَيْهَا وَلَا فَرْقَ اَدَمَ وَاعْقَابِهِ  
وَلَمُتَّحِقِينَ ۝ (سورہ قصص - ۸۳)

وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لئے  
مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی  
نہیں چاہتے اور نہ خدا کو راجح سمجھتے ہیں  
اور انجام کی بھلائی متفقین ہی کے لئے ہے۔

اس کے برعکس وصال کی پہچان، علامت اور خصوصیت جو رسول الشرا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بتائی وہ "کفر" ہے، جو اپنے وسیع تر معانی پر مشتمل ہے، حدیث صحیح میں

آتا ہے۔

انہ مکتوب بین عینیہ ک، ف، ت، ر  
اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان  
یقرہ اکل مومن کا تبا و غیر  
ک، ت، ر لکھا ہوگا جس کو ہر مومن پڑھ  
کا تبا لے  
سکے گا، خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا نہ ہو۔

## زندگی اور معاشرہ پردجال کا اثر

احادیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت داعی اور گرم جوش، چست و چالاک اور  
مذہب و اخلاق کے مقابلہ میں کفر اور بغاوت کا علمبردار ہوگا، ایک دوسری حدیث  
میں ہے:-

فوالله ان الرجل لياتيه وهو  
خدا کی قسم آدمی اس کے پاس آئے گا، وہ  
يحب ان مومن فيتبعه مما  
بجھتا ہوگا کہ وہ مومن ہے، پھر اس کا تتبع  
يبحث به الشبهات<sup>۲۷</sup>  
بن جائے گا، ان شبہات کی وجہ سے جو

وہ اس کے دل میں پیدا کر دے گا۔

اس کا معاملہ اتنا آگے بڑھے گا اور اس کی دعوت اس قدر عام ہوگی کہ کوئی گھرانہ اور  
خاندان اس سے محفوظ نہ رہے گا، نہ عورتیں اور نہ لڑکیاں اس کے اثر اور سحر سے آزاد رہیں گی  
گھر کا بڑا اور ذمہ دار اپنے گھر والوں، اپنی بیوی اور عورتوں اور لڑکیوں پر کوئی کنٹرول قائم  
نہ کر سکے گا، اور سب شتر بے مہار ہو جائیں گے۔

حدیث میں آیا ہے کہ:-

لے صحیح بخاری۔ ۲۷ ابوداؤد

ينزل الدجال بهذه السبعة  
بمرقنة فيكون اخر من  
يخرج اليه النساء حتى ان  
الرجل ليرجع الى امه وابنته  
واخته وعمته فيوثقها  
رباطا مخافة ان تخرج اليه  
دجال اكراس ثورا قطره من مرقاة  
میں پڑاؤ کرے گا، آخر میں اس کے پاس  
عورتیں گھروں سے نکل کے جائیں گی،  
پہلے کہ آدمی اپنی ماں اپنی بیٹی اپنی بہن اور  
اپنی بھوپھی کے پاس جائے گا، اور ان کو  
باندھ کے مقید کر دے گا، اس اندیشہ  
سے کہ یہ دجال کے پاس جائیں۔

سورائے کافس اور اخلاقی انحطاط اور زوال اس درجہ پر پہنچ جائے گا کہ  
حدیث کے الفاظ ہیں:۔

فیبقي شرار الناس في خفة  
الطيور واحلام السباع، لا يعرفون  
معروفا ولا ينكرون منكرا۔  
فیبقی شرار الناس فی خفۃ  
الطیور واحلام السباع، لا یعرفون  
معروفا ولا ینکرون منکرا۔  
صرف برے لوگ باقی رہ جائیں گے، جو  
پرندوں کی طرح ہلکے اور درندوں کی سی  
عقلیں رکھنے والے ہوں گے، نہ اچھالی کو  
وہ اچھالی سمجھیں گے نہ برائی کو برائی۔

موجودہ مادہ پرستانہ اور کافرانہ تہذیب کی یہ وہ بلیغ تعبیر اور زندہ تصویر ہے جس میں اس کے نقطۂ عروج کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے اور اس کے اہم مرکوز اور قلعوں کی بہت واضح طور پر نشان دہی کر دی گئی ہے یہ دراصل نبوت کے ان لافانی معجزوں میں سے ایک معجزہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جامع و مانع کلام کا ایک بہترین نمونہ ہے جس کے عجائبات و کمالات کبھی ختم نہیں ہوتے اور جس کی تازگی اور لہ طرانی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ صیحح مسلم (روایت عبد اللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ)

جنت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اس میں شہر نہیں کہ موجودہ تہذیب میں ایک طرف  
پرنڈوں کا سا ہلکاپن ہے کہ وہ فضاؤں میں اڑ رہی ہے اور ہوا کو تسخیر کر رہی ہے اور اس نے  
جدید انسان کو پرنڈہ سے تیز رفتار اور سبک بنا دیا ہے، دوسری طرف اس میں درندگی،  
خونخواری اور مردم آزاری کی وہ صفت ہے جس سے وہ پورے پورے ملکوں اور قوموں کو  
نیست و نابود کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتی، اور نہ صرف لہلہاتی فصلوں اور  
گل و گلزار زمینوں کو بلکہ باغ انسانی کو اس طرح تباہ و برباد کرتی ہے کہ اس کی نظیر تاریخ  
میں نظر نہیں آتی، اور یہ سب عیش و آرام، رزق کی فراوانی، راحت و آسائش اور آرائش  
و زیبائش کے اس ساز و سامان اور اسباب و وسائل کے ساتھ ہے، جو شائد تاریخ کے کسی  
اور دور میں اتنی کثرت و عمومیت سے ہمایا نہ ہوئے تھے۔

حدیث میں آتا ہے:-

وہم فی ذلک دار رزقہم حسن  
عیشہم  
اس حالت میں ان کا رزق بہن کی طرح  
بریں رہا ہوگا اور عیش کے سب سامان  
ہمایا ہوں گے۔

وہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم بہت اچھا کر رہے ہیں

یہ تہذیب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اس عالم مادی اور حیات دینی کی  
سوا ہر چیز کی منکر ہے، اور اس نے اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں اسی زندگی کی ترقی و  
خوشحالی اور تفریح و خوش طبعی پر مرکوز کر دی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کی  
۱۱۱ صبح سلم (روایت عبد اللہ بن عمرؓ)

آخری آیات کے ضمن میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس بات سے آگاہ کیا ہے اور اس میں مادی تہذیب کے تمام علمبرداروں اور ذمہ داروں اور عالم اسلام میں ان کے وفادار اور ہونہار شاگردوں کو اور زیادہ تعین کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے اور ان کی ایسی نازک اور سچی تصویر کھینچ دی گئی ہے جس میں ان کے خدو خال اور چہرہ کا اتار چڑھاؤ تک ابھر آیا ہے یہ وہ آیات ہیں جن میں طہرانہ مادیت اور اس کے دجالی رہنماؤں کا پردہ فاش کیا گیا اور ان کے اصل مکروہ کردار کو ظاہر کر دیا گیا ہے :-

اِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِی

الْاَرْضِ قَالُوا اِنَّمَا نَعْمٰی مُصْلِحُوْنَ

(سورہ بقرہ - ۱۱) آجھاؤ (تو کہتے ہیں) ہمارے کام خرابی

کے باعث کیسے ہو سکتے ہیں) ہم ہی تو

سنوارنے والے ہیں۔

یہ تصویر ان یہودیوں پر سب سے زیادہ منطبق ہے جنہوں نے تازیانوں اور تینبیہوں سے اتنی بھری ہوئی اور طویل تاریخ کے باوجود آخرت کو فراموش کر دیا، اس سے ان کی عالمی سرگرمیوں پر بھی زور پڑتی ہے جس نے عقل و حکمت، صنعت و سائنس، سیاست، حکومتوں کے انقلاب اور بغاوتوں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور اپنی غیر معمولی ذکاوت اور فکری و علمی صلاحیتوں کو صرف تخریبی اور منفی مقاصد انتشار پیدا کرنے اور انارکھی پھیلانے طاقت کے لئے کشمکش اور ایک نسل یعنی مقدس نسل اسرائیلی کی برتری اور صرف ایک قوم یعنی الشری "پسندیدہ امت" کی ریادت پر مرکوز کریں :-

قُلْ هَلْ يَسْتَعْلِمُ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا

(اے پیغمبر!) تو کہہ دے ہم تمہیں خبر دیدیں

الَّذِينَ مَلَ سَعَهُمْ فِي الْخَلْقِ الدُّنْيَا  
وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُجَسَّدُونَ مَعًا  
أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ  
وَلِقَائِهِمْ غَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ  
فَلَا تَنفَعُهُمْ تَوَكُّعُ الْقِيَامَةِ وَذُنُوبُهُمْ  
(سورہ کہف ۱۰۲-۱۰۱، ۱۰۰)

کون لوگ اپنے کاموں میں سبک زیادہ  
نامراد ہوئے؟ وہ جن کی ساری کوششیں  
دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس  
دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ  
بنایا ہے میں! یہی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار  
کا آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے  
سے منکر ہوئے پس ان کے سامنے کمال اکارت  
لگے اور اس لئے قیامت کے دن ہم ان کے  
اعمال کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے۔

## علم اور عقل انسانی کی کوتاہ نظری

قرآن مجید کائنات کے اس محدود تصور اور ناقص علم انسانی پر دوبارہ ضرب لگاتا ہے،  
جو اس وسیع کائنات کا علم رکھنے کا دعویٰ دار ہے، اور ارض و سما، مخلوقات و موجودات، ستاروں  
اور سیاروں، بروج، فضا اور خلائے بسیط نیز علم الہی سے تعلق رکھنے والی اور تمام اشیاء کو  
بھی اپنے علم کا پابند اور تنگ و تازی زد میں سمجھتا ہے، اور علم کے یہ نام لیوا علم کائنات کی خوشہیر  
کرتے ہیں، اور اس پر بہت ناز کرتے ہیں، حالانکہ ان کے معلومات سمندر کے ایک قطرہ اور صحرا کے  
ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں پہنچ سکے ہیں، یہ خود پسندی، فخر و غرور، اپنے معلومات و تحقیقات  
اور کسی خاص دور کے انسانی علم کے ذخیرہ پر حسد سے بڑھا ہوا اعتماد اور اس کے سوا ہر چیز سے  
انکار، تکبر، خود رائی، خود ستائی، فکر کی تنگی اور نظر کی پستی وہ ابتدائی ”جرثومہ“ یا مادہ ہے جس نے

مادیت کو اپنے رائے معانی و مقاصد کے ساتھ یا یوں کہئے کہ اپنے تمام شر و مفاسد کے ساتھ وجود بخشا ہے۔

یہ وہ بگڑی ہوئی انسانی نفسیات ہے جس نے کبھی ظلم و سرکشی پر آمادہ کیا ہے، کبھی الوہیت و ربوبیت کے دعویٰ پر کسا یا ہے، اسی نے ان لوگوں پر ظلم کروایا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح معرفت اور دور رس و عمیق نظر سے نوازا ہے (جیسا کہ اصحاب کہف کے قصہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے) اور صرف حاضر و موجود پر ایمان، متاع عارضی اور سراب زندگی سے عشق، دنیا میں ہمیشہ رہنے و آرام کے سامان باقی رہنے کا یقین نیز ہر اس شخص کی تحقیر پر آمادہ کیا ہے جو اس سامان ظاہری میں تہی دست و کم مایہ تھا، جیسا کہ دو باغ والے کے قصہ میں گزرا ہے، کبھی یہ محدود علم انسانی ہر اس چیز پر استعجاب و حیرت پیدا کرتا ہے، جو پہلی نظر میں غلط یا عقل کے معیار اور مشاہدہ احساس کی میزان کے خلاف معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ و خضرؑ کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کبھی یہ محدود، عاجز اور قاصر نگاہ خطا کر جاتی ہے اور دور کو قریب اور مجاز کو حقیقت سمجھ لیتی ہے جس طرح ذوالقرنین کو یہ محسوس ہوا کہ سورج ایک گندے چشمہ میں ڈوب رہا ہے:-

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ (اور چھیم کی طرف نکل کر اٹھا) بیان ملک  
وَجَدَهَا تُغْرِبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی حکایت پہنچ  
گیا، وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے (سورہ کہف - ۸۶)

ایک یاہ دلدل کی بھیل میں ڈوب جاتا ہے۔

یا جس طرح ملکہ سبا کو شیشے کے محل میں داخل ہو کر یہ دھوکہ ہو گیا کہ اس کے



فرش پر پانی بہ رہا ہے، چنانچہ اس نے جلدی سے اپنے پائے چڑھا لئے۔

قِيلَ لَهَا اِذْ خُلِيَ الصَّخْرُ فَلَمَّا رَاَهُ  
اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو اس نے

حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَتَمَ  
جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے

سَايَهُمْ كَهَآلِ اِنَّهَا صَوَّحُ مُعَذِّدَةٍ  
کے لئے اس نے اپنے پائے اٹھائے سلیمان

قَوَّارٍ لَّهُ  
نے کہا یہ شیشے کا چکن فرش ہے۔

اس سورہ کا اختتام بھی اس کے آغاز و مقدمہ کے ساتھ ہم آہنگ ایک زبان ہے۔  
اس میں بھی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم انسان کے علم سے زیادہ عظیم اور  
یہ کائنات انسان کے تصور سے زیادہ کشادہ اور وسیع ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلمات (اپنے  
وسیع مفہوم میں) انسان کے احاطہ سے باہر اور اس کی دسترس سے ماوراء ہیں اور اگر سارے  
درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی میں تبدیل ہو جائیں تب بھی اس کے کلمات کو

۱۷ سورہ نمل ۴۴ (اس قصہ کی تفصیل سورہ نمل میں بیان کی گئی ہے) ۱۷ علامہ آؤسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ  
کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم و حکمت ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے  
عجائبات و اسرار ہیں، جب وہ ان کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو ایک کلمہ ”کن“ سے ظاہر فرما دیتا ہے۔

۱۷ علم جدید نے کائنات کی وسعت ستاروں کے باہمی فاصلوں زمین سے ستاروں کی دوری روشنی کے سفر اور ایک  
ایک کہکشاں میں ستاروں کی تعداد و نظام شمسی کی کثرت سورجوں اور ستاروں کے حجم اور وزن و عجیب و غریب  
اور نازک لطیف قوانین فطرت اور اسباب جاذبیت جو اس عظیم کائنات میں جاری ہیں اور خلائے بیسیط میں  
ان کے درمیان صحیح تناسب اور ضروری توازن باقی رکھتے ہیں اور اس زمین پر زندگی کی بقا کے ضامن ہیں  
نیز خشکی اور تری کے تناسب اور اس کے اثرات و فوائد پر جو روشنی ڈالی ہے وہ پہلے کسی کے خیال میں بھی نہیں آ سکتی  
نعمیٰ تخلیقات کے دوسرے علوم و حقائق علم الحیاء، علم تشریح، علم الحيوان، علم النبات اور دوسرے علوم و فنون اس  
(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

ضبط تحریر میں نہیں لاسکتے:-

قُلْ لَّوْكَانَ الْبَحْرُ مِزَّةً زَكَاةً لَّوَقَّيْتُ  
رَبِّي لَغَدَا الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَقْدِرَ  
كَلِمَةً رَبِّي وَلَوْ جِئْتُ بِمِثْلِ مَدَدِ  
(سورہ کہف - ۱۰۹)

(اے پیغمبر!) اعلان کرنے اگر میرے دربار  
کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر  
سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی قلم ہو جائیگا  
مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگر  
ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ویسے ہی  
سمندر اور بھی پیدا کریں جب بھی وہ کھاتے نہ کریں۔

سورہ لقمان میں ہے:-

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ  
أَوْ لَاحٍ أَوْ الْبَحْرِ مِزَّةً زَكَاةً  
سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ  
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب  
قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے)  
جسے سات مزید سمندر و شمالی میرا کریں تب بھی  
اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی،  
بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔

(سورہ لقمان - ۲۷)

## نبوت کی ضرورت اور نبی کا امتیاز

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ کائنات اپنی وسعت اور موجودات کی

(باقی صفحہ ۱۳۱) علاوہ میں یہ وہ علوم ہیں جن کا تصور اور خواب بھی اسی میں شکل تھا، علم کی ایک شاخ پر پوری پوری شہرت  
وجود میں چمکی ہے اس کے لئے بہترین تجربہ گاہیں قائم کی جا چکی ہیں اور یہ سب معلومات ان معلومات کے علاوہ ہیں جن کا  
حضور معلومات سے کہیں زیادہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے درمیان کوئی تناسب ہی نہیں۔

کثرت کی وجہ سے انسانی طاقت اور بشری صلاحیت سے باہر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے کلمات کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے روئے زمین کے تمام درختوں کے قلم اور سائوں سمندروں کی روشنائی ناکافی ہے اور یہ سب چیزیں عقل انسانی اور علم انسانی سے ماوراء اور برتر و بالا ہیں تو پھر پروردگار کے عرفان اور اس کی صفات و آیات کے علم زندگی کے مہم کے صلے اور نجات و فلاح کے راستہ کی طرف رہنمائی کا آخر کیا طریقہ ہوگا؟ اور نبی کا جو خود بھی ایک بشر ہے دوسروں پر کیا امتیاز بجا جائے گا جب کہ یہ بات ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کی عقل کا صر اور علم محدود ہے ان سارے سوالات اور اشکالات کا جواب یہ آیت دینی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ارشاد ہوا ہے:-

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ

أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ ۚ

(سورہ کہف۔ ۱۱۰)

الشر نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا مبودوی

ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اس امتیاز و خصوصیت کا راز اور معرفت صحیحہ اور ایمان و عقائد کا سرشتیہ جس کے بغیر انسان کی فلاح و کامرانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا صرف ”وحی الہی“ ہے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ

(سورہ کہف۔ ۱۱۰)

میں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے ہی جیسا

ایک آدمی ہوں البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے

## آخری بات

اللہ تعالیٰ اس سورہ کو آخرت کے ذکر اس کی اہمیت کے اظہار اور اس کی دعوت و تبلیغ

کو زندگی کی اساس اور ہر عمل کی بنیاد بنانے کی دعوت پر ختم کرتا ہے، یہاں بھی خاتمہ آغاز کے ساتھ مربوط اور اس روح کے ساتھ ہم آہنگ ہم رنگ ہے جو پورے سورہ میں جاری و ساری ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ

عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ

رَبِّهِ أَحَدًا

اپنے پروردگار کی بندگی میں کسی دوسری شے کو

شریک نہ کرے (بس اس کے سوا میری کوئی

(سورہ کہف - ۱۱۰)

پکار نہیں!)

